اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

نومبر ۲۰۲۳ء

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۲ نومبر ۲۰۲۳ء شمارہ : ۵

ایڈیٹر : شوکت علی (سکریٹری)

معاون : محمد معاذ اختر احسن (سپرنٹنڈنٹ)

زرسالانہ : پچاس روپے -/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،

گومتی نگر لکھنؤ-226010

فون نمبر:0522-4022924

شوکت علی، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
احمد صدیق مجنوںؔ گورکھپوری	عبیداللہ چودھری	۳
غزل	انس مسرورؔ انصاری	۶
غزل	شریفؔ قریشی	۶
آزادی کے بیباک سپاہی...	ڈاکٹر غلام حسین	۷
غزل	شاہد پٹھان	۱۴
امام باندی بیگم عفتؔ عظیم آبادی	ڈاکٹر سلطان آزاد	۱۵
غزل	ماہرؔ لکھنوی	۲۱
غزل	گلشنؔ خیرآبادی	۲۱
لکھنؤ کا ایک گمنام شاعر...	ڈاکٹر سعید احمد	۲۲
غزل	سراج منظرؔ	۲۵
اُووَر بجٹ (افسانہ)	اشتیاق سعید	۲۶
غزل	مظہرؔ زاہدی	۳۰
غزل	جمال الدین نوازؔ	۳۰
بزم غزل از نجمی لکھنوی (تبصرہ)	ڈاکٹر اسلم مرتضیٰ	۳۱

●●●

اداریہ

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں نومبر کے مہینے کی خاص اہمیت ہے۔اس ماہ میں دو عظیم ہستیاں عالم وجود میں آئیں۔ایک پنڈت جواہرلال نہرواور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔یہ دونوں ملک کے عظیم ترین رہنما تھے۔پنڈت جواہرلال نہرو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم تھے۔ان کے یوم پیدائش ۱۴ر نومبر کو'یوم اطفال' کےطور پر پورے ملک میں منایا جاتا ہے۔اس موقع پر ہونے والے پروگراموں میں بچوں کے حقوق اوران کی ضرورتوں سے متعلق اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ہماری جو ذمہ داریاں ہیں ہم انھیں خاص طور سے محسوس کرتے ہیں اوران کا احساس بھی دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔بچوں کی ذہن سازی اور کردار سازی سے متعلق خصوصی گفتگو کی جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہی بچے مستقبل میں ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردارادا کریں گے۔اس موقع پر بچوں کو تنگ نظری،تعصب اور فرقہ پرستی جیسی لعنت سے بچانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم ان بچوں کی پرورش وپرداخت اور ذہنی نشو ونما میں کہاں تک اپنی ذمہ داری نبھارہے ہیں۔اکادمی دونوں کوخراج عقیدت پیش کرتی ہے۔

ہمیں ادب اطفال کی اہمیت اور ضرورت کی جانب بھی قلمکاروں کی توجہ مبذول کرانی چاہیے۔کیوں کہ اردو میں ادب اطفال کی صورت حال مایوس کن اور حوصلہ شکن ہی نظر آتی ہے۔گو کہ کچھ ادارے بچوں کے رسائل شائع کرتے ہیں اور چند قلمکار ہی بچوں کے ادب پر کچھ لکھتے ہیں۔بچوں کی ذہن سازی اور کردار سازی میں ادب اطفال ہی سب سے اہم اور موثر کردارادا کرسکتا ہے۔

اسی ماہ میں آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا یوم ولادت بھی ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ملک کے بلند پایہ سیاسی رہنماؤں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرایا اور ملک کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں کردارادا کیا۔وہ مجاہد آزادی اور سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ صاحب طرز ادیب،بلند پایہ صحافی اور عالم ومفکر تھے۔ان کی ادبی وسیاسی خدمات پر متعدد کتابیں بھی لکھی گئیں۔مولانا آزاد سیکولرزم کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔وہ عالم بھی تھے اور عامل بھی ان کے ارادوں میں فولادی قوت تھی جس کی بنا پر انھوں نے آزاد ہندوستان کی تعمیر وترقی بالخصوص تعلیم کے میدان میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دئے۔ان کی تصنیفات میں غبار خاطر اور الہلال والبلاغ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔مولانا آزاد کی شخصیت اور خدمات پر کام کرنے والے اس وقت تک ان کی فکر کو نہیں سمجھ سکتے جب تک وہ الہلال کا مطالعہ نہ کریں۔

اتر پردیش اردو اکادمی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے الہلال والبلاغ جو آؤٹ آف پرنٹ ہو چکا تھا،پروفیسر محمود الہٰی کے سیر حاصل مقدمے کے ساتھ از سر نو اس کا عکسی ایڈیشن شائع کیا جو اتنا مقبول ہوا کہ جلد ہی دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر لانا پڑا۔

شوکت علی
ایڈیٹر

ڈاکٹر عبید اللہ چودھری

''دانشکدہ''بسنت پور، گورکھپور-Mob.9235895921

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری اردو فکشن اور تحقیق وتنقید کا بڑا نام ہے۔ان کی ولادت ۱۵رمئی ۱۹۰۴ء کو ضلع بستی کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ابتدائی تعلیم ان کی دادی کے زیر سایہ منجھریا میں ہوئی۔دادی دینی تعلیم سے آراستہ تھیں یہی وجہ تھی کہ احمد صدیق کی ابتدائی تعلیم کی شروعات اردو، فارسی اور عربی میں ہوئی۔علاوہ ازیں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گورکھپور آئے ،گورکھپور ان کا نانیہال تھا۔یہاں سینٹ اینڈریوز کالج سے ۱۹۲۱ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔علی گڑھ سے ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ اس کے بعد انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۵ء میں انگریزی اور اس کے بعد اردو میں امتیازی نمبروں سے ایم۔اے پاس کیا۔اس کے بعد گورکھپور آکر سینٹ اینڈریوز کالج میں انگریزی اور اردو کے استاد رہے۔وہ اس حیثیت سے ۱۹۵۸ء تک رہے۔۱۹۵۸ء میں ہی وہ علی گڑھ آ گئے اور وہاں تاریخ ادب پروجیکٹ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (Assistant Director) کی خدمات پر فائز کیے گئے۔۱۹۶۸ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں کراچی یونیورسٹی میں اردو کے اعزازی پروفیسر رہے۔

مجنوں گورکھپوری کا نکاح ۱۴را کتوبر ۱۹۲۶ء کو عمل میں آیا تھا اولاد میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔۴رجون ۱۹۸۸ء کو کراچی میں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ہندوستان میں اردو افسانہ کے ابتدائی دور میں احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کا نام امتیازی شان کے ساتھ افق ادب پر جلوہ گر ہے۔مجنوں کے افسانے اپنے عہد کے پسندیدہ معروف افسانوں میں شامل ہیں۔وہ رومان پسند افسانہ نگار تھے ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع عورت اور محبت ہے اور وہ اسی رومانیت کے آغوش میں سکون تلاش کرتے ہیں جہاں کا ہر ذرہ رومان کے جذبے میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ان کا عشق ہی رومان ہے اور رومان ہی عشق ہے، مجنوں گورکھپوری کا نظریہ ہے کہ عورت محبت کے لیے پیدا ہوتی ہے۔اس کی پرستش کے لیے محبت کا جذبہ فطری ہے۔مجنوں کے افسانوں کے کردار اور ماحول گاؤں کی دیہاتی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ متوسط طبقے کے رہن سہن اور ان کے مسائل کی بہت منظّم اور بہتر تصویر کشی کرتے ہیں۔رومانیت اور جذباتیت کے ساتھ ساتھ مجنوں کے افسانوں میں فکر وعمل کا میلان بھی غالب نظر آتا ہے ساتھ ہی ساتھ ان کے افسانوں میں مغربی افسانہ نگاروں کے اثرات بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری نے اپنے بیشتر افسانے مارشل، فرائڈ، موپاساں اور تھامس ہارڈی سے متاثر ہو کر تخلیق کیے ہیں جس میں بھرپور رومانیت اپنی معراج کے ساتھ جلوہ گر ہے باوجود اس کے بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں مشرقی تہذیب وتمدن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے بلکہ علاقائی ومقامی رنگ وآہنگ کے ماحول کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اس کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔ ان کا طرز تحریر اور اسلوب بالکل منفرد اور نیا ہے جس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کی شخصیت اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے اردو فکشن کے حوالے سے جب ہندوستان کے فکشن نگاروں کی تاریخ سپرد قلم کی جائے گی، پریم چند کے ساتھ ساتھ دیگر افسانہ نگاروں میں مجنوں گورکھپوری کا نام بھی شامل کیا جائے گا۔ اردو ادب میں صنف افسانہ کی خاصی اہمیت ہے ادب کی دوسری اصناف کی طرح صنف افسانہ بھی انسانی معاشرے سے گہرا تعلق رکھتی ہے بلکہ افسانہ اور زندگی کے رشتے اتنے مربوط ومضبوط ہیں کہ انھیں کسی بھی طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ حقائق حیات اور واقعاتِ زندگی ہی افسانوں کو توانائی اور تابنا کی بخشتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے عہد کی معاشرتی سرگرمیوں، تاریخی تغیرات اور واقعاتی نشیب وفراز کا مطالعہ ومشاہدہ ہی نہیں کرتا بلکہ ذاتی سطح پر ان سے گزرتا ہے، جھیلتا ہے، برداشت کرتا ہے اور ان سے حاصل ہونے والے تجرباتی تاثرات کو ایک خاص فنی بصیرت اور فکری لگاؤ کے ساتھ افسانوی اسلوب میں منتقل کر دیتا ہے۔

افسانوں میں بالخصوص رومانیت کو مغربی خیالات کو ہم آہنگ کرانے میں مجنوں کے افسانوں نے اہم رول ادا کیا ہے مجنوں گورکھپوری کے صرف دو ہی افسانوی مجموعے ''سمن پوش'' اور ''خواب و خیال'' منظر عام پر آئے۔ ان میں موجود سبھی کہانیاں رومانیت سے لبریز ہیں۔ بقول خود مجنوں گورکھپوری:

> ''میں نے کبھی اپنے افسانوں میں قصداً و اہتمام کے ساتھ کوئی نکتہ یا عقدہ نہیں پیش کیا لیکن زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظر کے سامنے ضرور رکھتا ہوں۔ مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کی تلخ ترین حقیقت محبت ہے اور حقیقتوں پر محیط ہے چنانچہ میرے بیشتر افسانے محبت کے افسانے ہیں۔''

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں گاؤں کی زندگی اپنے پورے شباب پر نظر آتی ہے۔ گاؤں کے ہر فرد کی زندگی پر مجنوں کی گہری ناقدانہ نظر پڑتی ہے اور مجنوں گورکھپوری کا قلم ان احساسات وجذبات کو پیش کرنے میں کمال حاصل کرتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ موصوف حسن پرست ہیں اور وہ حسن کو حسن کی نظر سے دیکھتے ہیں اور تمام متاع حیات اس پر قربان کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس جذبۂ بے اختیار کو ناقدانہ اور فلسفیانہ نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس کو اپناتے ہیں جو حیاتِ انسانی کا گہرائی سے مطالعہ و تجزیہ کرتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری ترقی پسند ادب کے اہم ترجمان میں

سے تھے موصوف نے افسانے، ڈرامے، مضامین اور شاعری میں اپنا مخصوص انداز فکر واضح کیا ہے لیکن ان کی اصل شہرت تنقید نگاری کے میدان میں رہی ہے۔ ان کی تنقیدی کتب میں ''ادب اور زندگی''، ''نقوش وافکار''، ''تنقیدی حاشیے'' ''نکاتِ مجنوں'' اور ''دوشِ فردا'' خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

ادب میں زندگی ایک شعبہ ہے اور زندگی نام ہے ایک جدلیاتی حرکت کا اس کے بھی دو متضاد رخ ہیں۔ ایک تو خارجی یا علمی یا افادی اور دوسر داخلی۔ جمالیاتی حسن کے ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ ان متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قائم رکھے۔ اس ضمن میں مجنوں گورکھپوری ''ادب اور زندگی'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''ادب حال کا آئینہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کا اشاریہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لئے بیک وقت واقفیت، افادیت اور جمالیات، اجتماعیت اور انفرادیت سب کی ضرورت ہے ماحول ادیب کو پیدا کرتا ہے فکر ادیب کے ماحول کی مطابقت سے از سر نو تعمیر میں مدد کرتی ہے۔ ادب بیک وقت حال کی آواز اور مستقبل کی بشارت ہے سب سے بڑا ادیب وہ ہے جو حال اور مستقبل کو ہم آہنگ بنا کر پیش کرے۔''
>
> (''ادب اور زندگی'' مجنوں گورکھپوری ص ۶۵۔۶۴)

راقم الحروف کی نظر میں مجنوں گورکھپوری کی تحریریں اور ان کے تنقیدی نظریے سیاسی نعرے بازی اور پروپگنڈے سے پاک ہیں۔ ان کی فکر میں اشتراکی فکر کی سطحیت نہیں بلکہ گہرائی اور گیرائی ہے۔ انھوں نے مارکسی نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے انسان کے خیالات اور جذبات ماحول کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری نے ترقی پسند تنقید کو جِلا بخشی ہے۔ معروف محقق اور نقاد پروفیسر فضل امام رضوی کے درج ذیل اقتباس پر اپنی بات مکمل کرتا ہوں، وہ رقم طراز ہیں:

> ''مجنوں گورکھپوری صحیح معنوں میں ایک نفسیاتی نقاد تھے مجنوں گورکھپوری کا انداز نگارش سنجیدہ، متین اور باعظمت ہے۔ وہ سیدھے سادے انداز میں دقیق سے دقیق مسائل اور پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیوں کو آسانی سے ذہنوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ مجنوں گورکھپوری کے ذہن میں ہر لمحہ انقلابی لہر پیدا ہوتی رہتی تھی۔ وہ اپنے عہد کے موجودہ تہذیب وتمدن کی روش سے بیزار تھے وہ ادب کو جذبہ کی شکل میں ڈھالنے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ زبان سے زیادہ خیال اور مضمون کی اہمیت پر زور دیتے تھے۔ مجنوں گورکھپوری نے اردو تنقید کے انداز و معیار کو تبدیل کر کے اپنی تنقیدی تحریروں کے ذریعہ گہرے فلسفیانہ شعور کو بیدار کیا ان کے یہاں تنقیدی انتہا پسندی کی جھلک نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں توازن اور اعتدال بہرحال قائم رہتا ہے۔ وہ اپنی بات بہت سلیقے اور شعور سے پیش کرتے ہیں۔ اظہار خیال کے لیے مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اردو فکشن کے منفرد نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔''

❑❑❑

انس مسرورؔ انصاری
سکراول ٹانڈہ، امبیڈکرنگر-Mob.9453347784

غزل

سلسلہ دار کا تا دُور سجا رکھا ہے
میری ہر کارگزاری کا صلہ رکھا ہے

رات کتنی بھی اندھیری ہو مجھے خوف نہیں
میں نے پلکوں پہ چراغوں کو جلا رکھا ہے

لوگ کس طرح سے جیتے ہیں بتائے کوئی
ہم نے جینے کا فقط روپ بنا رکھا ہے

میرے حالات ہی بہتر ہیں تعارف میرا
نام کیا پوچھتے ہو نام میں کیا رکھا ہے

ہم تو خاموش تھے پہلے بھی سو اب کیا کرتے
وقت نے ہم پہ ہر اک ظلم روا رکھا ہے

سالہا سال ہوئے دن بھی جدائی کے گئے
پھر بھی اس نے ہمیں دیوانہ بنا رکھا ہے

حادثے راہ میں حائل ہوں تو غم کیا مسرورؔ
سر پہ جب ماں کا مری دستِ دعا رکھا ہے

●●●

شریفؔ قریشی
فتح گڑھ، فرخ آباد-Mob.9044674701

غزل

عرصۂ جدائی میں دل ہے بے قرار آ
حاصلِ شکیب آ، جانِ انتظار آ

تو اگر نہ آئے گا آس ٹوٹ جائے گی
رنگ اعتماد آ، نورِ اعتبار آ

ابر جھوم کر اٹھا، میکدے کا در کھلا
دل کی تشنگی بجھا ساقیِ نگار آ

اُجلی اُجلی چاندنی چھیڑتی ہے راگنی
رقص میں ہے زندگی رقص میں ہے پیار آ

پھر کہاں یہ صحبتیں پھر کہاں یہ محفلیں
چھوڑ ساری رنجشیں یار بن کے یار آ

اپنی داستانِ غم کس کے رو برو کہوں
میرے رازدار آ میرے غمگسار آ

اُس گلی میں آج پھر جان کی طلب ہوئی
اے شریفؔ یار کا یہ بھی قرض اُتار آ

●●●

ڈاکٹر غلام حسین
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ مادھو کالج،
اُجین (ایم پی)-Mob.9893853183

آزادی اور اردو کے بے باک سپاہی: قاضی محمد عدیل عباسی

جلیل القدر قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مجاہد آزادی اور مربیٔ اردو تھے۔ موصوف مفکر، مصنف، مقرر اور صاحب کمال مترجم تھے۔ ان کی عالمانہ عظمت، شرافت و ذکاوت شہرۂ عام اور بقائے دوام ہے۔ وہ انقلابی صحافی، تجربہ کار سیاست داں، ماہر اقبالیات، مخلص اور محبوب رہنما تھے۔ وکالت کے میدان میں انھیں جو شہرت ملی وہ بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ لوگ انھیں وکیل بابا ہی کہتے تھے۔ احتراماً اصل نام کسی کی زبان پر نہیں آتا۔ ایسی فخر روزگار اور برگزیدہ ہستی سے شرف ملاقات کی دیرینہ خواہش تھی۔ خیر اس طول امل کی تکمیل اس وقت ہوئی جب میں نے 1977ء میں ''بستی'' کے ایک کالج میں داخلہ لیا۔ اس اثنا میں وکیل بابا کی صحبت میسر ہوئی جو میرے لیے نعمت غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس وقت وہ اپنی عمر کے آخری پڑاؤ پر تھے گویا وہ چراغ سحری تھے مگر اضمحلال کی کیفیت عیاں نہیں تھی بلکہ چہرے پر بشاشت اور تمکنت کے آثار نمودار تھے جو کامیاب اور بھرپور زندگی کی غمازی کرتے تھے۔ وہ روشن خیال تھے اور دم واپسیں تک کانگریس کے اصول و نظریات پر کاربند رہے۔ قومی پالیسی میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات سے متفق تھے۔ بود و باش و لباس میں وہ مجسم مثالی کانگریسی تھے اور جمہوریت کے پرستار بھی۔ سفید کھدر کی قمیض، پاجامہ، ٹوپی، شیروانی زیب تن کرتے جس سے جلال شاہی ٹپکتا تھا۔ سفر ہو یا حضر دونوں صورتوں میں، انکساری، خاکساری مدنظر رہتی۔ انھوں نے اپنی ضروریات زندگی کو محدود کر رکھا تھا۔ سفر میں بستر بند کے ساتھ چند جوڑے کپڑے، بانس کی چھوٹی سی ڈولچی جس میں منجن، آئینہ، کنگھا اور ایک شیشی میں تلخ روغن ہی ان کی آرائشی اشیاء تھیں۔ حفظان صحت پر ان کی گہری نظر تھی، خورش کا خاص خیال رکھتے اور بزہر پگاہ پر اتفاق کرتے تھے۔ اسّی (80) سال کی عمر میں توانا اور تندرست تھے، کثرتی بدن تھا۔ سردیوں میں جب دھوپ صحن میں آتی تو کبھی کبھار مگدر آزماتے۔ وہ فارغ البال تھے۔ فرماں بردار اور بھرپور آباد اہل خانہ سے خوش و خرم تھے۔ انھیں فقط قوم و زبان کا غم ستاتا تھا جس کے تدارک کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ قلم کے دھنی تھے ان کا قلم آہنی تھا۔ چند گھنٹوں میں صفحہ کے صفحہ سیاہ کر دیتے۔ وہ علاج و معالجے میں بڑے حساس تھے۔ اہل

خانہ اور دیگر متعلقین کی صحت پر وہ خاص دھیان دیتے تھے۔ اگر کسی کو چھینک آجائے تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرتے اور تشخیص کی تشویش کرتے۔ اس وقت کے معروف ڈاکٹر کملادت ترپاٹھی اور رمیش چندر شریواستوان کے معالج خاص تھے۔ جب بھی طبیعت ناساز ہوتی تو ڈاکٹر صاحبان آپ کے یہاں آتے۔ وہ ان کی بڑی آؤ بھگت کرتے، بڑے قرینے سے ایک لفافہ میں فیس رکھ کر ڈاکٹر صاحب کی جیب میں رکھ دیتے اور ڈرائیور کو بھی چپکے سے اپنے ملازم کے ذریعے کچھ رقم پہنچا دیتے۔ ڈاکٹر ترپاٹھی کا رشتہ اس گھرانہ سے دیرینہ تھا۔ جب وہ ان کے بزرگوں کو دیکھنے آتے تو فیس کسی قیمت پر نہیں لیتے، بس سر جھکا دیتے اور دست شفقت کے طلبگار ہوتے۔ وکیل بابا کو دواؤں سے متعلق بڑی معلومات تھی۔ میز پر دواؤں کی شیشیاں اور نسخے پڑے رہتے اور بغل میں صاف شفاف سفید چادر چارپائی پر پڑی رہتی جس سے کسی کلینک کا گماں ہوتا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں آپ کا جہاں آباد تھا۔ گول میز پر لکھنے پڑھنے کے سامان، کتابیں، رسائل اور دیگر ضروریات زندگی کی چیزیں موجود ہوتیں۔ سامان کو سمیٹ دیا جاتا اور اس پر دسترخوان بچھا دیا جاتا۔ وہ کبھی اکیلے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ بغل میں ایک تخت پڑا تھا جو انجمن تعلیمات دین کا دفتر تھا۔ اسی تخت پر مصلیٰ بچھا کر نماز بھی پڑھ لیتے۔ اگر وطن مالوف سے کوئی عزیز آجاتا تو اس کی بھی چارپائی ایک طرف لگ جاتی۔ اس وقت قاضی صاحب انجمن تعلیمات دین کے سکریٹری تھے، حکیم احمد حسن صبوحیؔ قادر الکلام شاعر، عربی، فارسی اور اردو زبان کے ماہر اور انجمن تعلیمات دین کے صوبائی آرگنائزر تھے۔ مجیب بستوی بستی ضلع کے آرگنائزر تھے۔ آپ کا زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے میں گزرتا۔ ان کے پاس بے شمار اخبار و رسائل اور کتابیں آتی تھیں۔ قومی سطح پر آپ کے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا۔ خط کا جواب دینا ان کے واجبات میں شامل تھا۔ مضامین بھی وہ سپرد قلم کرتے۔ وہ جو بھی لکھتے، قلم برداشتہ لکھتے۔ نظر ثانی کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کرتے۔ لکھنے کے بعد اندر سے پکا ہوا چاول منگواتے اور خط چسپاں کرکے سپرد ڈاک کے لیے ملازم کو دے دیتے۔ وہ کارڈ یا انتر دیشی استعمال کرنا خلاف تہذیب سمجھتے تھے، ہم نے یہ وطیرہ اکثر بڑے آدمیوں میں دیکھا ہے۔

کلام اقبالؔ میں مرد مومن کا جو تصور ہے، قاضی صاحب اس کے آئینہ دار تھے۔ انھیں علامہ اقبالؔ کے بے شمار اشعار از بر تھے جنھیں وہ اکثر ورد زبان کرتے رہتے۔ اس سے وہ اپنے روح کو تڑپاتے اور قلب کو گرماتے تھے۔ اس سے ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ فلسفۂ زندگی کی ترجمانی میں وہ اکثر یہ شعر پڑھتے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

ان دنوں بی۔اے کے نصاب میں علامہ اقبالؔ کی نظم شامل تھی جس کا یہ شعر ؎

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو' کا بے پروا خرام

وہ حضَر بے برگ وساماں، وہ سفر بے سنگ و مِیل

سہو کاتب سے حضر، خضر میں تبدیل ہو گیا تھا جسے طلباء کیا، اساتذہ بھی بے تامل خضر ہی پڑھتے تھے انھوں نے اس کی تصحیح کی۔ آپ کو علامہ اقبالؔ سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل تھا اور وہ ان کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ کی جن آنکھوں نے علامہ کو دیکھا تھا میں نے ان مبارک آنکھوں کو دیکھا ہے۔ علامہ اقبالؔ تو آپ کے آئیڈیل تھے ان کے کردار، گفتار اور اشعار کو انھوں نے اپنا حرز جاں بنالیا تھا اور ان کی طرز زندگی کو اپنا لیا تھا۔ حسن اتفاق یہ کہ انھوں نے بخشو کو اپنا گھریلو ملازم رکھا کیونکہ علامہ اقبالؔ کے بھی بخشو نام کے ملازم تھے۔ بخشو فرض شناس اور وفا دار تھے۔ وکیل صاحب کو کب سونا ہے، کب کھانا ہے، کب آرام کرنا ہے ان سب کا وہ خوب خیال کرتے۔ بستر بڑے اہتمام سے لگاتے بستر کے شکن کو اپنے کندھے پر رکھے ہوئے انگوچھے سے دور کرتے اور جب ان کو اطمینان ہو جاتا کہ اب بستر شکن زدہ نہیں ہے تو وہ مچھر دانی لگا دیتے۔ انھوں نے برسہا برس بابا کے پاس اپنی زندگی گزاری۔ اور ان کے انتقال کے بعد بھی وہ گھر کے ایک فرد کی طرح وہاں رہے۔ آپ کے صاحبزادے محمد ارشد عباسی، بخشو کا خاص خیال رکھتے ....وکیل بابا کے پاس بڑے بڑے شعراء وادباء تشریف فرما ہوتے۔ ''شاہنامہ اسلام'' کے خالق حفیظ جالندھری بھی تشریف لاتے اور وہ ان کی میزبانی کرتے۔ اپنے مداحوں کی فرمائش پر وہ اپنا کلام سناتے۔ بخشو بابا کو حفیظ جالندھری کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ ایک بار میں نے ''بشارت خواب میں پائی کہ اٹھ ہمت کا ساماں کر'' گنگناتے ہوئے سنا۔ ادبی محفلیں دیر تک چلتیں تو بخشو بابا اٹھتے اور وکیل بابا کا بستر درست کرنے لگتے۔ یہ اشارہ ہوتا کہ وکیل صاحب کے آرام کا وقت ہو گیا ہے اور محفل برخاست ہو جاتی۔

وکیل صاحب صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ افطار کا بڑا اہتمام کرتے اور ان کی یہ خواہش ہوتی کہ افطاری میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں۔ پیرانہ سالی میں جب کہ ان کے گھٹنے کا درد بڑھ گیا تھا تب بھی اس کی پروا کئے بغیر وہ مسجد جایا کرتے تھے بھلے ہی سجود وقعود میں انھیں دقت پیش آتی تھی۔ جمعہ کی نماز ''خیر انٹر کالج'' کی مسجد میں ادا کرتے، جب مسجد سے نکلتے تو ایک دستی میں بندھی ہوئی ریزگاری اپنی جیب سے نکالتے اور وہ میرے سپرد کر دیتے۔ میں اسے باہر بیٹھے فقیروں میں تقسیم کر دیتا۔ شاید اس میں یہ مصلحت ہوتی کہ بانٹنے والے کو بھی ثواب مل جائے۔ آپ کو مجاہد آزادی کی پنشن ملتی تھی جسے لینے کے لیے وہ کچہری جایا کرتے تھے۔ وہاں ان کا بڑا خیر مقدم ہوتا کیونکہ ایک زمانہ تھا جب ان کا شمار نامور وکلاء میں ہوتا تھا۔ پنشن کا دن اہل خانہ کے لیے بڑی خوشی کا ہوتا، اس دن سب کو کچھ نہ کچھ ملتا۔ آپ کے ہاتھ میں بے شمار دولت آئی لیکن کبھی اپنے پاس ایک پرس تک نہیں رکھا۔ ایک معمولی سا لفافہ جو ڈاک کے لئے استعمال کرتے تھے اسی میں پیسے رکھتے تھے۔ سوتے وقت وہ اسے تکیہ کے

نیچے رکھ دیتے۔انھوں نے لاکھوں کمایا مگر مٹھی کھلی ہوتی تھی اندوختہ ایک پیسہ نہیں رکھا۔عزیز و اقربا، متعلقین ،غریبوں، مسکینوں میں بانٹ دیتے تھے ۔اس وقت بھی ان کا بینک بیلنس وہی لفافہ تھا۔سفر میں جب بھی میں ان کے ساتھ ہوتا تو وہ لفافہ مجھے سونپ دیتے۔جب ضرورت پڑتی تو اسے لے لیتے۔میں نے کبھی یہ ٹوہ نہیں لگایا کہ آیا اس میں کتنی رقم ہے؟ اور وکیل بابا کا یہ عالم تھا کہ اس لفافہ کو آنکھ بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیتے ، یہ راز میرے اور بابا کے درمیان تھا۔آج میں نصف صدی کے بعد اس لیے لکھ رہا ہوں کہ بابا کے قریب جو بھی ہوتا وہ اس پر کس قدر اعتماد کرتے تھے۔وہ جہاندیدہ اور مردم شناس تھے۔وہ کشادہ ذہن اور وسیع القلب تھے۔سب کے لیے ان کے دل میں جگہ تھی۔جب انھوں نے دیکھا کہ میری مالی حال ابتر ہے تو اپنے دفتر میں کیمپ کلرک کی حیثیت سے میرا تقرر کر دیا۔اس سے مجھے بڑی راحت ملی اور حصول تعلیم میں کوئی پریشانی واقع نہیں ہوئی۔

ہم اور اطہر حسین اوسط درجے کے طالب علم تھے لیکن وکیل بابا کو یہ گمان تھا کہ دونوں ذہین ہیں ، ہم دونوں کو آئی۔اے۔ایس بنانے کا خواب بننے لگے۔اپنے صاحب زادے قاضی محمد ارشد عباسی سے صلاح مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ تاراشنکر ناشادؔ کی کوچنگ کا تعاون حاصل کیا جائے۔کچھ دنوں کے بعد وکیل بابا کا انتقال ہو گیا اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔کاش بابا کی حیات اور دراز ہوتی ! بابا اپنی حین حیات میں غریب پروری کے لیے مشہور تھے۔بستی میں جب میں زیرِ تعلیم تھا تو شدید بیمار پڑا اور زندگی سے ایک دم مایوس ہو گیا۔یہ تو بابا کی دست گیری تھی کہ میں موت کے منہ سے باہر نکل آیا۔وہ خود مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے جاتے ،ڈاکٹر کو دکھاتے اور دواؤں کا بندوست کرتے۔کافی عرصہ تک میں زیر علاج رہا، بابا نے ہر طرح میری معاونت کی۔آج میں جب خرابیِ صحت سے نڈھال ہو جاتا ہوں تو مرحوم کی بہت یاد آتی ہے۔خدا آپ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔آمین

وکیل بابا کا یہ معمول تھا کہ جاڑوں میں انگیٹھی جلواتے۔ہم لوگ اس کے اردگرد بیٹھ جاتے اور وہ بڑے سبق آموز واقعات سناتے۔وہ ایک اچھے مورخ تھے۔سلطنت اور ریاست کے عروج وزوال کی کہانی سناتے ، بادشاہوں کے کردار واطوار کا ذکر کرتے۔افغانوں اور ترکوں کی مہمان نوازی کا بیان کرتے۔اپنے طالب علمی کی زندگی کے زمانے کی باتیں کرتے جو حیرت انگیز ہوا کرتی تھیں۔ان کی باتیں بڑی کردار ساز ہوا کرتی تھیں۔کاش ! ان کو میں نوٹ کر لیتا تو آج بڑی کارآمد ثابت ہوتیں۔تقریباً دو سال تک خضر صفت بزرگ کی صحبت میں گزرا جو میری زندگی کے لیے یادگار رہے۔ہم اور اطہر حسین آپ کے گھر کے فرد کی طرح تھے۔کبھی تو ایسا ہوتا کہ ہم دونوں کے حوالے گھر چھوڑ کر پورا کنبہ باہر چلا جاتا۔ جب وہ آنکھوں کے علاج کے لئے گورکھپور گئے تو ہفتوں ہم لوگوں نے گھر کی دیکھ بھال کی۔آپ کی ذاتی ڈائری شائع ہوئی تو اس میں ہم دونوں کا بھی تذکرہ دعاؤں کے ساتھ کیا ہے۔آج بھی آپ کے اہل خانہ سے وہ رشتہ استوار ہے۔

آپ کے صاحبزادے محمد ارشد عباسی صاحب کے حسن سلوک اور رواداری پر جان نثار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہو بہو وہی خُو بو، جستجو و آرزو آنجناب کے فرزند ارجمند میں بھی ہے۔

بلند اقبال قاضی صاحب کی ولادت 13 مارچ 1898ء کو ساکن بیارہ کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ جہاں ان کی تعلیم وتربیت سازگار ادبی ماحول میں ہوئی۔ آپ کے دادا قاضی عبداللہ صاحب کو داستان سننے کا شغف تھا۔ اس لیے ان کے یہاں باغ و بہار، فسانۂ عجائب، داستان امیر حمزہ اور دوسری قبول عام داستانیں سنی اور سنائی جاتی تھیں۔ ان کے والد قاضی محمد بسم اللہ شاعر تھے جن کا تخلص عاصیؔ تھا۔ اس ادبی ماحول کا اثر قاضی صاحب کی ابتدائی زندگی پر گہرا پڑا اور زبانِ اردو ان کی سرشت میں شامل ہوگئی۔ انھوں نے گاؤں سے متصل ایک سرکاری اسکول میں پرائمری کی تعلیم حاصل کی۔ مڈل اسکول کی تعلیم کے لیے انھیں اپنے گاؤں سے دس میل کے فاصلے پر واقع ''ہلّور'' قصبہ جانا پڑا۔ ان دنوں زیادہ دوری پر مڈل اسکول ہوا کرتے تھے۔ تعلیم عام نہیں تھی بس گنے چنے لوگ ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے وہ پچاس (50) کلومیٹر کی دوری گھوڑا گاڑی سے طے کرتے تھے۔ ان دنوں آمد و رفت کے ذرائع نہیں کے برابر تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول بستی میں جب داخلہ لیا تو اس وقت اردو کے معروف افسانہ نگار منشی پریم چند معلّم کے عہدے پر فائز تھے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے:

''اس زمانہ میں ایک نہایت خاموش انسان اسکول میں ٹیچر ہو کر آئے۔ وہ پگڑی باندھتے تھے۔ بند گلے کا کوٹ یا اچکن اور پائجامہ پہنتے تھے۔ وہ چونکہ نیچے درجات کو پڑھاتے تھے۔ میرا اور ان کا سابقہ کم تھا۔ مگر لڑکے ان کو بہت نیک تصور کرتے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام دھنپت رائے ہے۔ ان کا چھوٹا بھائی مہتاب رائے میرا کلاس فیلو اور عزیز دوست تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں معمولی تھا مگر کھیل میں اس کا بڑا نام تھا۔

(بحوالہ تحریر بے عدیل۔ مرتب ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی۔ ص۔ 202)

اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ گورکھ پور گئے، جہاں سے بی۔ اے کی ڈگری بڑی محنت اور جانفشانی سے حاصل کی۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ میں مستغرق رہتے۔ کالج کی لائبریری سے استفادہ کے علاوہ باذوق اہل علم اور باثروت حضرات کے تعاون سے ذاتی لائبریری بھی قائم کی۔ ان دنوں کا یہ معمول تھا کہ تقریباً تین سو صفحات کے مطالعہ کے بغیر وہ سوتے نہیں تھے۔ اس وقت سینٹ اینڈریوز کالج میں مجنوں گورکھپوری زیر تعلیم تھے جو قاضی صاحب کے جونیئر تھے بعد میں وہ وہیں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کے والد فاروق دیوانہؔ صاحب سے قاضی صاحب کے بڑے اچھے روابط تھے۔ ان کی استعانت واعانت کے بڑے ممنون تھے۔

انھوں نے 1920ء میں وکالت کی تعلیم کے لیے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا، جہاں ان دنوں رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری فروکش تھے۔ ان سے ادب اور سیاست کے

موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتے رہتے تھے۔فراقؔ گورکھپوری نے جب اپنا مجموعہ کلام ''گلِ نغمہ'' شائع کیا تو اس میں شامل نظم ''ترانۂ خزاں'' کے نوٹ میں قاضی صاحب کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستان میں جب تحریکِ ترکِ موالات کی ابتداء ہوئی تو قاضی صاحب نے اپنی تعلیم ترک کی اور تحریک میں شامل ہوگئے۔اس پر ان کے سرپرست الف ہوئے مگر انھوں نے اس کی پروا نہیں کی اور گھر کو خیر باد کہا۔مجاہد آزادی، شاعر اور صحافی حسرت موہانی کی رفاقت میں انھوں نے کچھ دنوں کانپور میں قیام کیا۔اس کے بعد انھیں بجنور کے ''مدینہ'' اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں جگہ مل گئی۔اخبار کے مالک مجید حسن صاحب، قاضی صاحب کے قلم کے قائل تھے۔مگر وہ اعتدال پسند تھے اور قاضی صاحب آزادی کے معاملے میں انتہا پسند تھے۔اس لیے ان دونوں حضرات میں زیادہ دنوں تک رشتہ استوار نہیں رہ سکا۔تب اس وقت کے مشہور اخبار ''زمیندار'' میں صحافتی خدمات انجام دیں۔لاہور کے دوران قیام علامہ اقبالؔ سے ملاقات ہوئی اور وہ ان کی حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔جس سے ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ان میں علامہ اقبالؔ کے شاہین کی روح حلول ہوگئی۔وہ پیکر خودی اور حریت کے پروانے بن گئے۔انگریزی حکومت کے خلاف شعلہ بار مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جس سے ان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی گئی۔مسلسل محنت کی وجہ سے ان کی طبیعت خراب رہنے لگی اور وہ اپنے آبائی وطن واپس چلے گئے۔ابھی وہ زیر علاج تھے کہ انگریزوں نے انھیں گرفتار کر لاہور سنٹرل جیل بھیج دیا۔وہاں کی زندگی اذیت ناک تھی۔انھوں نے ناقابلِ بیان صعوبتیں اٹھائیں۔کھانا ایسا ناقص کہ قوت لایموت کے لیے طوعاً و کرہاً کھانا پڑا۔کبھی کبھار تو وہ پسی ہوئی کالی مرچ میں پانی ملا کر روٹی حلق کے نیچے اتار لیتے روزہ کے ایام میں بھی یہ سلسلہ جاری رہتا۔مجاہدین آزادی کی قربانی اور ایثار سے ملک کے ہر باشندے کا سر فرطِ عقیدت سے جھک جاتا ہے۔قید سے رہائی کے بعد وہ اپنی نامکمل تعلیم کی تکمیل کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گئے۔اس دوران بھی ان کا واسطہ صحافت سے برقرار رہا۔وہ ''صدائے عام'' اور ''صدائے مسلم'' کے لیے اداریے لکھتے رہے۔ ایل۔ایل بی اور ایم۔اے ایک ساتھ اچھے نمبروں سے پاس کیا۔اس کے بعد وہ اپنے آبائی ضلع بستی پہنچے جہاں وہ عدالت اور سیاست میں بیک وقت سرگرم عمل ہوئے۔انھوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبر شپ بھی قبول کی۔ایم۔ایل۔اے کے انتخاب میں کوہ قامت رئیس کو مات دی۔سیاست اور وکالت کے میدان میں رہ کر ملک وقوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ اس منزل اوّل میں وہ تین عظیم ہستیوں سے از حد متاثر ہوئے۔اس کا اعتراف انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے:

> ''میں زمانۂ طالب علمی سے اقبالؔ کی نظم ابوالکلام کی نثر اور حسرت موہانی کے عمل کا بڑا معتقد رہا اور بڑے ذوق وشوق سے ان تینوں کا مطالعہ کرتا تھا۔اور

ان سب نے میری زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔اس نو عمری کے زمانے میں اکثر میرا جی چاہتا تھا کہ ان تینو ں کی تصویریں اپنے کمرے میں آویزاں کر کے اس پر امیر خسرو کے اس شعر کا کتبہ لگادوں ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم باخلق ما را کار نیست

(جہان اقبال۔مرتب محبوب سعید حارث۔ساجد میموریل کمیٹی گورکھپور۔ص۔16)

آزادی اور صحافت کے دوران تحریر اور تقریر کی جو چنگاری چمکی تھی وہ کچھ دنوں کے لیے سیاست اور وکالت میں مدھم پڑگئی، مگر یہ دبی ہوئی چنگاری موقع بہ موقع شعلہ بن جاتی تھی۔انھوں نے جب 1968ء میں حج بیت اللہ کی زیارت کی تو اس کی مؤثر اور عقیدت مندانہ روداد ''سفرحج'' کے نام سے قلم بند کی جو قبول عام ہوئی۔اقبال کی شاعری سے وہ از حد متاثر تھے چنانچہ 1971ء میں ''اقبال کا فلسفۂ حیات وشاعری'' لکھ کر ماہرین اقبالیات کی صف میں جگہ بنالی۔ 1978ء میں آپ کی قابل ذکر تصنیف ''تحریک خلافت'' ترقی اردو بیورو، دہلی سے شائع ہوئی جس کی بڑی پزیرائی ہوئی۔انھیں اردو اور انگریزی زبان پر بھرپور عبور تھا۔مختلف مسئلہ ومسائل پر وہ دونوں زبانوں میں بے ساختہ اظہار خیال کرتے تھے۔ ترجمہ میں انھیں اس قدر مہارت تھی کہ ہاتھ میں انگریزی کا اخبار ہوتا اور زبان سے اردو کے الفاظ نکلتے۔دوران اسیری انھوں نے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ ''بم کا نسخہ'' کے نام سے کیا تھا۔تاراچند کی کتاب ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ ان انڈیا (History of the Freedom Movement in India) جلد اول اور سوم کا ترجمہ ترقی اردو بیورو، دہلی نے کروایا اور اسے شائع کیا۔انگریزی میں بھی آپ کی ایک کتاب (Spect of politics and society) منظر عام پر آئی ہے۔قاضی صاحب کی کچھ کتابیں پس از مرگ شائع ہوئی ہیں۔''آئینہ شب وروز'' (ڈائری) کو ان کے ورثاء نے مرتب کر کے شائع کروایا۔اس کا تعارف اور پیش لفظ اردو کی دو ممتاز ہستیوں شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے جو اس ڈائری کے وقار میں مضاعف ہیں۔

انھوں نے بے شمار مقالات، مضامین اداریے اور کتابچے لکھے ہیں جو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں جو دستیاب ہوئے ہیں اسے ''تحریر بے عدیل'' میں یکجا کر دیا گیا ہے۔اس بیش بہا کتاب کو ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔

''جرأت رندانہ'' افسانوں کا مجموعہ ہے جو قاضی صاحب کی وفات کے تقریباً تیس سال بعد شائع ہوا۔اسے آپ کے لائق نواسے حارث سعید نے مرتب کر کے ساجد میموریل کمیٹی گورکھ پور سے شائع کروایا۔یہ مجموعہ بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔افسانہ نگاری کے میدان میں انھوں نے اپنی زندگی کے اواخر میں قدم رکھا اور اصلاح معاشرہ کے لیے بڑے سبق آموز افسانے لکھے۔وہ اردو کی زبوں حالی سے از حد متفکر تھے۔وہ اردو کے شیدائی اور فدائی تھے۔انھوں نے ''برج بانو'' کے عنوان سے جو کہانی لکھی ہے اس کے صرف بیان سے ان کے خونِ جگر کا رنگ عیاں ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد انھوں نے اردو تحریک میں

اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔اس سے اردو کو حیات نو ملی ہے۔ یقیناًان کی خدمات نقش کالحجر کی حیثیت رکھتی ہیں۔وہ اردو تحریک کے روح رواں اور سالارِ کارواں تھے۔اس کی پرزور وکالت اور مربیانہ رہبری کی ہے۔خود کفیل مدارس کے توسط سے اس کی جڑوں کو مضبوط کیا ہے۔ترقی اردو ہند کی صوبائی اور ضلعی سطح پر تشکیل نو کی ہے۔اس کے زیر اہتمام کانفرنسوں اور اجلاسوں کے انعقاد سے اردو کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ انھوں نے اردو کو مقبول عام کرنے کے لیے لائبریریاں قائم کیں۔اتر پردیش میں جب اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا تو اس کی کارروائی اور کارکردگی کے وہ رُکن رکین رہے۔اہلِ علم وادب، دانشورانِ قوم اور محبانِ اردو آپ کی خدمات کے قدرداں اور معترف ہیں۔سابق وزیر اعظم آنجہانی آئی۔کے۔گجرال نے ان کی اردو خدمات کو مشعل راہ قرار دیا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین ان کی اردو دوستی سے متاثر ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے آپ کی مساعی کو پس ماندہ اردو آبادی کے لیے ''نسخۂ کیمیا'' قرار دیا ہے۔شارب ردولوی نے ملک و قوم کے اس عاشقِ اردو کی قربانیوں کو سراہا ہے۔یہ تابناک ستارۂ اردو 22 مارچ 1980ء کو غروب ہو گیا جس کے کارہائے نمایاں کی تابنا کی آج بھی برقرار ہے۔ان کے وقیع وارفع، کار آمد اور کارساز کارناموں کی صدائے بازگشت دم بدم گونجتی رہے گی اور محبانِ اردو کے تن خاکی میں جان پیدا کرتی رہے گی۔ بالیقین آپ نے اردو کی جو بے لوث اور بے باک خدمات انجام دیں ہیں اس کے پیش نظر اگر انھیں ''بابائے اردو ثانی'' کے لقب سے سرفراز کیا جائے تو مناسب ہوگا۔بے شک ع

یادگارِ رونقِ محفل ہے پروانے کی خاک

❑❑❑

شاہد پٹھان
جے پور(راجستھان)-Mob.9372843907

غزل

کچھ عجم کا تھا، کچھ عرب کا تھا
درد میرے سخن میں سب کا تھا

خون کی ہولی کھیلتے تھے لوگ
خوف دنیا میں کس کو رب کا تھا؟

دے تو سکتے تھے ہم جواب اُنھیں
پاس لیکن ہمیں ادب کا تھا

بے وفا نکلا آخرش وہ بھی
شور جس کے حسب نسب کا تھا

جام و مینا تھے پہلے غزلوں میں
تذکرہ محفل طرب کا تھا

ہر کسی سے نہ ہو سکا مانوس
دل ہمارا الگ ہی ڈھب کا تھا

وقت سے جو مجھے ملا شاہدؔ
کب مری خواہش و طلب کا تھا

●●●

سلطان آزاد
پنولین،گلزار باغ، پٹنہ-Mob.8789934730

امام باندی بیگم عفّتؔ عظیم آبادی: ایک برگزیدہ شخصیت

ہندوستان کے زمیندارانہ نظام میں لاکھوں زمیندار، نوابین اور رؤسا ہوئے جنہیں دولت و ثروت اور اقتدار ملے۔ان میں کئی شخصیتیں اپنے سماجی وثقافتی، تمدنی اور علم وادب کی ہنرمندی کے باعث ان کے اسمائے گرامی تاریخوں اور کتابوں میں درج ہیں لیکن بہتیرے ارباب اقتدار، زمیندار اور رؤسا صرف اپنے عیش وعشرت میں ڈوبے رہے اور اپنے اقتدار اور طاقت کا بے جا استعمال کر کے گزر گئے۔ ان کے نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔لیکن جن شخصیتوں نے اپنے دورِ اقتدار میں دولت و ثروت کا صحیح استعمال کرتے ہوئے سماج کی فلاح و بہبود میں صَرف کیا ان کے کارنامے زندہ جاوید ہوگئے۔ایسے اکابرین کی تاریخ آج بھی شہادت دیتی ہے کہ ان کے فلاحی کارنامے اور ہنرمندی، علم پروری نہ صرف لائق تحسین ہیں بلکہ آج بھی لوگ اُن سے بہرہ منداور مستفیض ہورہے ہیں۔ ان چند عظیم شخصیتوں اور اکابرین میں ایک باوقار اہم شخصیت کا نام امام باندی بیگم ہے۔

امام باندی بیگم کا خاندانی حسب ونسب اس طرح ہے:

”عالم گیر بادشاہ اورنگ زیب کے عہد میں جب سربلند خاں، عظیم آباد کے صوبہ دار بنائے گئے تو انھوں نے اپنا نائب شیخ عبداللہ کو غازی پور، یوپی میں مقرر کیا اور منتخب صوبیدار سربلند خاں نے محلّہ کٹرہ اختیار میں ایک مکان ۱۷۰۷ء میں تعمیر کرایا اور اس جگہ کا نام گلزار باغ رکھا جو گلزار باغ وقف اسٹیٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

امام باندی بیگم صاحبہ کا سلسلۂ نسب شیخ عبداللہ ناظم غازی پور سے ملتا ہے ان کے تیسرے فرزند نواب سعداللہ خاں تھے اور موصوف کے ایک فرزند نواب علی اعظم خاں کے نام سے تھے۔آپ کی ایک بیٹی بجی بیگم کے نام سے تھیں۔بجی بیگم کی بیٹی وحیدالنساء تھیں، جن کی شادی میر سعادت علی سے ہوئی تھی۔ان ہی کی بیٹی امام باندی بیگم جو اپنے چار بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ان کے بھائیوں کے نام یہ ہیں: ”میر محمد، میر علی، میر حسن، میر حسین۔“

(بحوالہ: مختصر تاریخ۔وقف اسٹیٹ گلزار باغ، پٹنہ از مولانا سید اسد رضا، اشاعت ندارد)

امام باندی بیگم صاحبہ کے مورث اعلیٰ نواب فضل علی خاں صوبہ بہار کے نائب اور غازی پور کے ناظم تھے۔صوبہ

بہار کے شہر عظیم آباد میں ان کی جاگیر کا نام گلزار باغ تھا۔ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۲۹ء ہے۔ان کے شوہر نواب سعادت علی خاں، جو پیرا کی میں ایسے یگانۂ روزگار تھے کہ تیرتے ہوئے گنگا پار کرجاتے تھے۔ایک بار گنگا ندی میں تیرتے وقت 'مگر' نے ان کا پاؤں پکڑلیا اور ان کی لاش تک کا پتہ نہ چلا۔ یہ حادثہ ۱۲۵۵ھ میں ہوا تھا۔نواب سعادت علی خاں پیرا کی کے علاوہ شعروسخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔تمکینؔ ان کا تخلص تھا۔یہ نورالحسن خاں کے صاحبزادے تھے۔نواب سعادت علی خاں تمکینؔ کے دواشعار ملاحظہ ہوں

گر نشہ ہے یہی نگہ میں تری
مئے کے پینے کی احتیاج نہیں

نام تمکینؔ ہوا تو کیا ہمدم
رات دن بیقرار رہتا ہوں

(بحوالہ: ریختہ فاؤنڈیشن، بتاریخ ہشتم ،صفر، روزشنبہ، ۱۲۵۵ھ)

۱۲۵۵ھ میں جوان کے شوہر کے ساتھ حادثہ ہوا۔ اس وقت امام باندی بیگم کی عمر صرف اٹھائیس (۲۸) سال تھی۔اولاد میں صرف ایک بیٹا واجد علی خاں تھے جو کمسنی میں فوت ہوگئے۔روایت ہے کہ امام باندی بیگم شوہر اور بیٹے کی موت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے سارا علاقہ اور جائداد وقف کردی اور اپنے بھتیجوں کو متولی قرار دیا۔وقف کا سال ۱۸۹۰ء ہے۔

ان کی موقوفہ جائداد اور ان کے حسن وسلوک کے متعلق مولانا سید اسد رضا صاحب اور مشہور مورخ فصیح الدین بلخی کتاب ''تذکرہ نسوان ہند'' مطبوعہ ۱۹۵۶ء کی روایتیں بالترتیب درج ہیں:

''.......وہ اس وقف کی خود متولیہ اور منتظمہ تھیں، بلکہ تاریخ کی وہ ممتاز خواتین جو دیندار اور مخیّرہ مانی جاتی ہیں ان میں بیگم صاحبہ کا نام بھی شامل ہے۔آپ بڑی باہمت اور پختہ عزائم کی مالکہ تھیں۔ایک واقعہ تاریخ میں آج بھی سنہرے حرفوں میں تحریر ہے، موصوفہ بڑی جائداد کی مالکہ تھیں۔زراعت کی زمین بھی کافی تھی۔کہا جاتا ہے کہ اسّی (۸۰) ہزار بیگھہ کی مالکہ تھیں۔رعایا کو زراعت کے لئے پانی کی سخت تکلیف کا سامنا ہوا۔ سب نے مل کر احتجاج کیا۔فوراً ہی آپ نے نہر کے کھودنے کا حکم دیا۔''

(بحوالہ مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ ،گلزار باغ، پٹنہ از مولانا سید اسد رضا، اشاعت ندارد)

''.......بہار شریف اور خسرو پور کے درمیان ایک موضع میں اپنی ذاتی نگرانی میں پانچ ہزار بیلداروں کو لے کر ایک رات میں ایک میل کے قریب لانبی نہر کھدوادی اور اس کے صلہ میں بیلداروں کو بیس ہزار روپئے انعام دیئے۔ بعد میں مخالف زمینداروں نے مقدمہ دائر کیا اور مقدمہ پری وی کونسل تک پہنچا تو ججوں نے باور نہ کی کہ ایک پردہ نشیں عورت نے ذاتی نگرانی میں اتنی بڑی نہر رات بھر میں کھدوائی ہوگی۔بیگم صاحبہ مذہب تشیع میں بڑی راسخ الاعتقاد تھیں لیکن ان کے عقیدہ میں تعصب کو دخل نہ تھا۔نہر کے مقدمہ کے دوران میں انھوں نے فریق ثانی کے منیجر اور منتظم کو جوسنی المذہب تھے، پیام دیا کہ وہ اگر ان کی طرفداری کریں تو

ایک لاکھ روپیہ صلہ دیا جائے گا۔ منتظم نے جواب دیا کہ بیشک یہ رقم تو اتنی ہے کہ پشت ہا پشت کے لئے آسائش کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ لیکن خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ میں نمک حرامی اور بددیانتی نہیں کرسکتا۔ مقدمہ کے انفصال کے بعد یہ منتظم کنارہ کش ہوکر گوشۂ عزلت میں بسر کرتا تھا۔ اس وقت بیگم صاحبہ نے اس کو کہلایا کہ اگرچہ مقدمہ میں آپ میرے مخالف تھے۔ لیکن میں آپ کی دیانت داری کی قدرشناس ہوں۔ آپ میری ملازمت میں آجایئے اور آپ کے بعد آپ کی اولاد کے ساتھ بھی یہی سلوک جاری رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''

(بحوالہ: تذکرہ نسوانِ ہند از فصیح الدین بلخی، مطبوعہ ۱۹۵۶ء)

غازی پور، یوپی میں بھی زمینداری تھی۔ امام باندی بیگم وہاں کی جائداد کی دیکھ ریکھ بھی کررہی تھیں۔ اس کی روایت مولانا سید رضا اپنے کتابچہ بعنوان ''مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ گلزار باغ، پٹنہ میں رقمطراز ہیں:

''......آپ کی غازی پور میں کافی عالی شان عمارت چہل ستون کے نام سے تھی۔ جس کا صدر دروازہ اب بھی موجود ہے اور وہ پرانی تاریخ کی یاد دلاتا ہے۔ سرنگ اور پھانسی گھر جیسی نادرات ہونے کی بنا پر آج بھی یہ عمارت خلائق کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ وہاں ایک پتھر بھی نصب ہے جس پر تحریر ہے 'یہ زمین امام باندی بیگم نے انگریز حکومت سے مقدمہ لڑکر واپس لی' باغ کے تالاب کے بارے میں مشہور تھا کہ بیگم صاحبہ سرنگ کے ذریعہ تالاب تک غسل کرنے جایا کرتی تھیں۔ یہ باغ اس وقت باون (۵۲) بیگھہ کا تھا۔ اب اس باغ میں سنٹرل گورنمنٹ نے ریل کی پٹری بچھادی ہے اور ریاستی حکومت نے بائی پاس کے لئے کافی چوڑی سڑک بنا دی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ باغ اب اٹھائیس (۲۸) بیگھہ میں سمٹ گیا ہے۔ اس باغ میں ایک مسجد اور کافی قدیم مقبرہ بھی ہے۔''

مختصر یہ کہ بیگم صاحبہ نے اپنی ساری جائداد جو صوبہ بہار اور شہر غازی پور، یوپی میں تھی سب کو وقف کردیا۔ انھوں نے حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا اور عتبات عالیات کی زیارتوں سے مشرف ہوئیں۔ انھوں نے گلزار باغ پٹنہ میں لبِ سڑک، عالم گنج تھانہ کے مدمقابل امامیہ مسجد اور امام باڑہ کی تعمیر کرائی۔ علاوہ ازیں وقف ہاؤس کے مدمقابل اپنے اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والوں کے لئے الگ سے مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جس کی پرانی مسجد خاکسار نے بھی دیکھی تھی۔ اب یہ مسجد جدید تقاضے کے مطابق تعمیر ہوچکی ہے جس کی دیکھ ریکھ اب مقامی مسجد کمیٹی کے ارکان کرتے ہیں۔ اس مسجد میں امام باندی کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔

امام باندی بیگم اگرچہ زمیندار اور بے شمار دولت وثروت کی اکیلی مالکہ اور منتظمہ تھیں لیکن اپنی زندگی عیش و عشرت کے ساتھ گزارنے کے بجائے عوامی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی فکر کرتی تھیں۔ وہ صوبۂ بہار کی ایک مشہور ومعروف مخیّرہ اور باصلاحیت خاتون تھیں۔ وقف کردہ وقف اسٹیٹ کے اندر ایک خوبصورت اور شاندار امام باڑہ ہے جو دُور سے دیکھنے پر اس کے محراب وگنبد سے کربلا معلیٰ کی شبیہ معلوم ہوتا ہے۔ اس امام باڑہ میں محرم کی مجالس عزا کے علاوہ سال بھر دوسری مجالس بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ اس امام باڑہ

کی تعمیر امام باندی بیگم نے اپنے زمانہ میں کرائی تھی۔

امام باندی بیگم صاحبہ علم وادب کی شیدائی بھی تھیں۔ وہ نہ صرف شعروسخن سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ ادب نوازی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انھوں نے اپنے امام باڑہ میں مرثیہ خوانی کے لئے مشہور زمانہ اور معروف رثائی شاعر مرزا دبیرؔ کو آنے کی دعوت دی بلکہ انھیں عشرۂ محرم میں مرثیہ خوانی کے لئے ہر سال پانچ ہزار اشرفی دیا کرتی تھیں۔ اس رقم کے بارے میں مولانا اسد رضا نے اپنے کتابچہ بعنوان ''مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ، گلزار باغ، پٹنہ'' میں لکھا ہے جبکہ اس سے زیادہ کا تذکرہ محمود علی خاں صباؔ نے آٹھ ہزار روپیہ نذرانہ کا ذکر کیا ہے جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی رقم تھی۔ یہ سلسلہ صرف مرزا دبیرؔ کے وقت تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کے پوتے تک جاری رہا۔ مرزا دبیرؔ کا تعلق عظیم آباد سے امام باندی بیگم کی وساطت سے ہوا۔ اس سلسلے میں مرزا محمد زماں آزردہؔ اپنی مذکورہ کتاب ''مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے، مطبوعہ ۲۰۰۵ء میں لکھا ہے کہ:

> ''مرزا دبیرؔ کا تعلق صوبۂ بہار بالخصوص عظیم آباد سے رہا ہے۔ عظیم آباد سے وابستگی اور دلچسپی اس بات کا مظہر ہے کہ وہ جب تک حیات رہے مستقل عظیم آباد آتے رہے۔ شادؔ عظیم آبادی، سید مسعود حسن رضوی ادیب اور سید محمود علی خاں صباؔ اس بات پر متفق ہیں کہ مرزا دبیر عظیم آباد پہلے پہل نواب جعفر خاں فیضؔ کی استدعا پر تشریف لائے تھے۔''

''مرزا دبیرؔ عظیم آباد میں'' از محمود علی خاں صبا، مطبوعہ مضمون سہ ماہی معاصر، پٹنہ ۱۹۷۳ء میں محمود علی خاں صباؔ نے لکھا ہے کہ:

> ''مرزا دبیرؔ عظیم آباد میں امام باندی بیگم کے ہاں دولی گھاٹ میں فرود ہوئے مگر مجلس کا انتظام نواب علی عظیم خاں کی گلزار باغ کی حویلی کے امام باڑہ میں کیا گیا۔ موجودہ امام باڑہ کی تعمیر اس وقت نہیں ہوئی تھی۔ بعد کو امام باندی بیگم صاحبہ نے باہر کے رہائشی مکان جہاں نواب نورالحسن خاں اور جعفر حسن خاں رہا کرتے تھے، کو توڑ کر اسی جگہ ایک نہایت شاندار امام باڑہ زرِکثیر خرچ کر کے تعمیر کرایا۔''

محمود علی صباؔ مزید لکھتے ہیں:

> ''مرزا دبیرؔ جب تک زندہ رہے اس امام باڑہ میں عشرۂ محرم کی مجلس پڑھی۔ امام باندی بیگم صاحبہ نے بھی دل کھول کر مرزا دبیرؔ کی عزت افزائی کی۔ آٹھ ہزار روپیہ نذرانہ کے علاوہ خلعت وزادِراہ عنایت کرتیں۔ ۱۹/دسمبر ۱۸۹۰ء کو امام باندی صاحبہ نے امور خیر کے لئے اپنی کُل املاک وقف کر دی اور وقف نامہ میں مرزا دبیرؔ کے خاندان نسلاً بعد نسلٍ عشرۂ محرم کی مجلس پڑھنے کے لئے مقرر کر دیا۔''
>
> (حوالہ: مرزا دبیرؔ عظیم آباد میں از محمود علی خاں صباؔ، سہ ماہی معاصر، پٹنہ ۱۹۷۳ء)

امام باندی بیگم صاحبہ، خود شاعرہ تھیں اور یہ مرزا دبیرؔ کی شاگردہ تھیں۔ بہ حیثیت رثائی شاعرہ مذکورہ کتاب ''بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقا از سلطان آزاد، مطبوعہ

۲۰۲۰ء میں نمونۂ کلام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ''مرزا دبیؔر اور ان کے بہاری تلامذہ''، تحقیقی مضمون مشمولہ کتاب تحقیق وتوضیح، مطبوعہ ۲۰۲۲ء میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ویسے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اپنی مذکورہ کتاب ''دبستان دبیؔر'' مطبوعہ ۱۹۶۶ء میں امام باندی بیگم صاحبہ کی ادب نوازی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''عظیم آباد کی مشہور، ادب نواز اور شیدائے اہل بیت خاتون سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ، عفّت، مرزا صاحب (مرزا دبیؔر) کی شاگرد اور بہار کی ایک جلیل القدر شاعرہ تھیں۔ آپ ہی نے ۱۸۶۰ء میں مرزا صاحب کو لکھنؤ سے عظیم آباد بلوایا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد سے جب تک مرزا زندہ رہے ہر سال محرم میں عظیم آباد جاتے تھے۔ ان کے انتقال سے مرزا اوج اور مرزا محمد طاہر رفیع اس منبر کو زینت دیتے رہے اور اب مرزا محمد طاہر کے صاحبزادے مرزا محمد صادق ہر سال اس امام باڑے کی مجالس پڑھتے ہیں۔ گویا گلزار باغ پٹنہ کے اس تاریخی امام باڑہ میں مرزا صاحب کا خاندان مستقل ایک سو سال سے خواندگی کر رہا ہے اور نواب امام باندی بیگم صاحبہ کی بدولت آج بھی اس خاندان کی کفالت ودستگیری کر رہی ہے۔''

مرزا دبیؔر کے امام باڑہ گلزار باغ میں آنے کا سال بقول فصیح الدین بلخی ۱۲۷۰ھ بمطابق ۱۸۵۳ء ہوتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے مطابق ۱۸۶۰ء ہے۔

امام باندی بیگم صاحبہ، عفتؔ عظیم آبادی کا تذکرہ بحیثیت شاعرہ، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی کتاب ''دبستان دبیؔر (مطبوعہ ۱۹۶۶ء) اور بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقاء از سلطان آزاد، مطبوعہ ۲۰۲۰ء اور مذکورہ مضمون بعنوان ''مرزا دبیؔر اور ان کے بہاری تلامذہ'' مشمولہ مجموعۂ مضامین ''تحقیق وتوضیح'' از سلطان آزاد (مطبوعہ ۲۰۲۲ء) میں ملتا ہے۔ جبکہ تذکرہ نسوان ہند از فصیح الدین بلخی (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) میں باب ''شہیرات'' میں ان کے ذاتی وصف کی حیثیت سے شہرت یافتہ خاتون کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

امام باندی بیگم صاحبہ عفّتؔ عظیم آبادی کی شعروشاعری کے دوسرے اصناف کی خبر تو کہیں سے نہیں ملتی البتہ رثائی شاعری کی اطلاع ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی سے ملتی ہے وہ فرماتے ہیں:

''امام باندی بیگم صاحبہ، سلام اور نوحے وغیرہ کہتی تھیں اور عفّتؔ تخلص فرماتی تھیں۔ ان کے چند سلام ''دفتر ماتم'' میں شائع ہوئے ہیں اور بعض سلاموں کی مرزا نے تخمیس بھی کی ہے۔ ان کے اشعار میں خلوص وتاثیر کے ساتھ ہی مضمون آفرینی کی سعی بھی پائی جاتی ہے۔ اور جو کچھ کہتی تھیں دل کی گہرائی سے کہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اچھے اچھے شعر نکال لیتی تھیں۔ ان کی زبان بڑی پاکیزہ اور ستھری ہے۔''

بلاشبہ ان کے اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر بلند پایہ کا شعر کہتی تھیں۔ ان کے ایسے کلام میں عقیدت بھی ہے اور بھرپور ادبیت بھی۔ نمونۂ کلام اس طرح ہے ملاحظہ ہوں:

پایا یہ اوج مدح درِ بو تراب سے
مطلع سلام کا ہے بلند آفتاب سے
روشن ہے دین سبط رسالت مآب سے
جس طرح رات چاند سے دن آفتاب سے
زانوے شمر و سینۂ بے کینۂ حسین
اپنا تو دم اُلٹتا ہے اس انقلاب سے
لیتا ہے حسن روئے مبارک خراج میں
بوگل سے، رنگ لالہ سے، نور آفتاب سے
سر پر وہ چار گیسوئے مشکیں ہیں آشکار
جن سے دو چار ہووے نہ سنبل حجاب سے
غنچہ سکوت میں لب جاں بخش کے حضور
شبنم عرق عرق درِ دنداں کی تاب سے
پر حیف خطِ عارضِ تاباں میں ہے رقم
اس نوجواں کا سِن نہ بڑھے گا شباب سے

....

مجرئ خاتون محشر پر ہے محشر ان دنوں
شاہ دیں بے گور ہیں زینب ہیں بے گھر ان دنوں
شام ہوتی ہے کہیں اور صبح ہوتی ہے کہیں
روز وشب گردش میں ہیں زہرا کے اختر ان دنوں
تپ کی شدت، باپ کا ماتم اور ایذائے سفر
ہو گئے ہیں اور بھی سجاد لاغر ان دنوں
کربلا کہتی تھی زینب سے یہ کیا ہے ماجرا
دیکھ کر منہ میرا رو دیتے ہیں سرور اِن دنوں

مختصر یہ کہ امام باندی بیگم عفت عظیم آبادی اپنے وقت کی مشہور خاتون، مخیّرہ، سماجی وفلاحی خدمت گزار، رعایا پرور، شاعرہ، ادب نواز اور مہمان نواز تھیں۔ اکثر علماء بھی ان کے مکان میں مہمان ہوا کرتے تھے۔ ان میں مفتی میر عباس صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایسی مشہور شہرت یافتہ علم پرور اور ادب نواز خاتون کو اپنے وقت کی برگزیدہ شخصیت کہہ سکتے ہیں۔ اس برگزیدہ شخصیت کا انتقال ۲۸ رصفر مطابق ۱۴ راگست ۱۸۹۴ء کو ہوا۔ ان کا مقبرہ ان کے وقف ہاؤس کے پچھّم جانب نجی قبرستان میں ہے جہاں ان کے فرزند اور ان کے شوہر کا فرضی مقبرہ بھی اُسی چہار دیواری میں ہے۔ ان کی یاد میں برائے ایصال ثواب ہر سال سہ روزہ دیسہ کی مجالس امام باندی بیگم وقف اسٹیٹ کے امام باڑہ میں منعقد ہوتی ہیں۔

حوالے:

۱۔ مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ گلزار باغ۔ از مولانا سید اسد رضا
۲۔ تذکرہ نسوان ہند۔ از فصیح الدین بلخی
۳۔ دبستان دبیر۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی
۴۔ بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقاء۔ از سلطان آزاد
۵۔ مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے۔ از مرزا محمد زماں آزردہ
۶۔ تحقیق وتوضیح۔ از سلطان آزاد
۷۔ سہ ماہی رسالہ معاصر، پٹنہ (۱۹۷۳ء)

❑❑❑

ماہرؔ لکھنوی
نظر باغ، لکھنؤ-Mob.7380339484

غزل

آتے رہتے ہیں وہ ہر روز دِکھانے آنسو
کیا کریں دیکھ کے ہم اُن کے پرانے آنسو

کل مجھے دیکھ کے محفل میں کچھ ایسے روئے
کہ سر بزم لگے خوب بہانے آنسو

جب بھی دیکھو انھیں برہم ہی نظر آتے ہیں
ہم نے دیکھے نہیں آنکھوں میں سہانے آنسو

جوش کہتا ہے کہ اب ترک تعلق کر لوں
ہوش کہتا ہے کہ چھوڑو ہیں دِوانے آنسو

رازِ دل میں نے چھپانے کی بہت کوشش کی
لیکن افسوس مری بات نہ مانے آنسو

ان کے ہونٹوں پہ نہیں دیکھی تبسم کی نمود
صرف آجاتے ہیں پلکوں پہ ستانے آنسو

دیکھ کر جس کو بجھے پیاس ہماری ماہرؔ
ہم نے دیکھے نہ وہ چاہت کے سہانے آنسو

●●●

اشفاق علی گلشنؔ خیرآبادی
خیرآباد، سیتاپور-Mob.9807307077

غزل

جدھر بھی دیکھتا ہوں روشنی معلوم ہوتی ہے
کہ تیرے شہر میں اب زندگی معلوم ہوتی ہے

اک ایسا سانحہ بستی میں گزرا ہے کہ حیراں ہوں
ہراک انساں کی آنکھوں میں نمی معلوم ہوتی ہے

گھرے ہیں اس طرح کچھ لشکرِظلم وستم میں ہم
مقابل موت کے یہ زندگی معلوم ہوتی ہے

ملے تو کس طرح پھر منزل مقصود اے لوگو!
یہ دنیا راہ سے بھٹکی ہوئی معلوم ہوتی ہے

گھرا ہوں گردش دوراں میں جب سے دیکھتا ہوں میں
مری نظروں میں دنیا اجنبی معلوم ہوتی ہے

بدل ڈالا مری تقدیر کو بیٹی نے پڑھ لکھ کر
یہ دنیا اب تو میری دوسری معلوم ہوتی ہے

علامت ہے کسی طوفان کے آنے کی اے گلشنؔ
جدھر بھی دیکھتا ہوں خامشی معلوم ہوتی ہے

●●●

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی
ٹھاکر گنج، لکھنؤ-Mob.9455551607

لکھنؤ کا ایک گمنام شاعر (نفیس احمد صدیقی نفیسؔ لکھنوی)

اردو زبان و ادب کے دو اہم مراکز تسلیم کئے گئے ہیں، پہلا دہلی اور دوسرا لکھنؤ۔ اس کے علاوہ رامپور کو بھی دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ ان جگہوں پر ماضی بعید میں کثیر تعداد میں شعراء و ادباء گزرے ہیں جن کا شمار قدما میں کیا جاتا ہے۔ ان مراکز کے علاوہ دیگر شہروں اور قصبات میں لاتعداد شعرا و ادباء گزرے ہیں جن سے لوگ بالکل ناواقف ہیں۔ لکھنؤ جیسے اردو کے مرکز میں بھی نہ جانے کتنے شاعر، ادیب، صحافی اور دانشور گمنامی کے غار میں جا چکے ہیں۔ ایسی ہی گم نامی میں جانے والے ایک شاعر نفیسؔ لکھنوی ہیں۔

ویسے لکھنؤ میں اکیسویں صدی کے آخر میں نفیسؔ تخلص رکھنے والے دو شاعر گزرے ہیں ایک مولانا قاری عبدالحئ ندوی بھی تھے جن کا تخلص نفیسؔ لکھنوی تھا۔ عرفان عباسی نے اپنے تذکرہ ''شعرائے اتر پردیش'' کی بائیسویں جلد میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ خیر! میں یہاں پر جن نفیسؔ لکھنوی کا ذکر کر رہا ہوں وہ حافظ کلیم اللہ صدیقی صاحب کے سگے بڑے بھائی تھے جو دارالمبلغین، پاٹا نالہ لکھنؤ میں اکاؤنٹس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حافظ کلیم اللہ صدیقی صاحب میرے غریب خانہ واقع رجب گنج، ٹھاکر گنج، لکھنؤ پر مورخہ ۲/ مارچ، ۲۰۲۳ء کو تشریف لائے اور اپنے مرحوم بھائی نفیسؔ لکھنوی کے بارے میں نہ صرف معلومات فراہم کیں بلکہ ان کی ایک غزل ترنم سے بھی سنائی جو درج ذیل ہے ۔

عشرتِ دل کی ضرورت تھی جوانی کے لئے
زندگی وقف ہوئی غم کی کہانی کے لئے

لائی ہے گردشِ تقدیر بہاریں غم کی
اشک بیتاب ہیں آنکھوں میں روانی کے لئے

برق و طوفان کی سازش نے ہمیں لوٹ لیا
نہ رہی خاکِ نشیمن بھی نشانی کے لئے

سب یہیں چھوڑ کے جانا ہے کسی اور جگہ
کوئی ساماں نہ کرو ہستیٔ فانی کے لئے

بعد مرنے کے بھی یاد آئیں گے ہم دنیا کو
چند غزلیں ہیں نفیسؔ اپنی نشانی کے لئے

مندرجہ بالا غزل کے مطالعہ سے بہ آسانی اندازہ

لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر کا کلام انتہائی پختہ اور پاکیزہ ہے۔ کلام میں فکر کی گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، کلام اصلاحی ہے، کلام میں تصوف کی جھلک ہے۔ شاعر کے قلب پر فانی دنیا کی حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ اصل میں نفیس احمد صدیقی خاندانی شاعر ہیں۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ صدیقی (پیدائش ۱۹۱۴ء) بھی شاعر تھے اور جھپٹ لکھنوی کے نام سے مشہور تھے۔ آپ نے زیادہ تر ہزلیہ کلام کہا ہے اور اپنے دور میں ممتاز مزاحیہ شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی۔ نفیسؔ صاحب کے چچا عبداللطیف صدیقی (ولادت ۱۹۱۶ء) تھے۔ یہی نہیں، ننہال کے تعلق سے ماموں محمد اسماعیل صدیقی صفتؔ لکھنوی بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ ''نقوشِ صفت'' ان کے دیوان کا نام تھا۔ دیوان کے سرورق پر مندرجہ ذیل شعر لکھا تھا۔

کتابِ زیست کا پلٹا ہوا ورق ہوں میں

تمہارے واسطے اہلِ جہاں سبق ہوں میں

محمد اسماعیل صدیقی صفتؔ لکھنوی، نفیسؔ صاحب کے اکلوتے ماموں تھے۔ ماموں کی زندگی زیادہ ترغموں میں گزری کیونکہ اہلیہ ان کو چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ صرف ایک ہی بیٹی تھی جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔

نفیسؔ صاحب کے نانا نعمت علی صدیقی بھی شاعر تھے اور نعمتؔ کانپوری تخلص تھا۔ نیز صاحب دیوان شاعر تھے پیشے کے لحاظ سے نانا درزی تھے اور ٹوپیاں سیتے تھے۔ نعمت کانپوری کے بیٹے نے لکھنؤ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ محلّہ رستم نگر میں ذاتی مکان تھا۔ اس طرح نفیسؔ صاحب کو اگر نجیب الطرفین شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا نفیسؔ صاحب کے شاعر ہونے میں مجھے کوئی تعجب نہیں کیونکہ جس شخص کے والد، بھائی، ماموں اور نانا شاعر ہوں۔ اگر نفیسؔ صاحب شاعر نہ ہوتے تو تعجب والی بات ہوتی۔

موجودہ دور کے مدح صحابہ کے مشہور و معروف شاعر جناب محمد فاروق جاذبؔ لکھنوی نفیسؔ لکھنوی کے دوستوں میں رہے ہیں۔ جاذبؔ صاحب بچپن میں گھر سے اسکول نہ جا کر صفتؔ لکھنوی کے پاس چلے جاتے تھے۔ گھر والے سمجھتے تھے کہ فاروق اسکول گیا ہے۔ جب محمد فاروق کی اسکول سے مستقل غائب رہنے کی شکایت گھر والوں کو ملی اور عدم حاضری کی وجوہ کی تحقیق کی گئی معلوم ہوا کہ فاروق صاحب صفتؔ لکھنوی کے پاس جاتے ہیں اور ان سے شاعری سیکھتے ہیں۔ تلاش کرنے پر بستہ میں غزلوں کے کئی پرچے بھی برآمد ہوئے۔ محمد فاروق جاذبؔ لکھنوی نے اپنی کتاب ''کشف الدجیٰ'' میں سرسری طور پر اس بات کا ذکر بھی کیا ہے۔

نفیسؔ لکھنوی کا نام نفیس احمد صدیقی تھا۔ آپ کی ولادت محلّہ گڑھیا سلطانپور، سعادت گنج، ضلع لکھنؤ میں

۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ صدیقی تھا۔ وہ مولوی گنج میں چپلوں کی ہیل بنانے کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے سبھی بچوں کو تعلیم دی تھی۔ نفیس صاحب کی یکے بعد دیگرے دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی ۱۹۵۶ء میں (محلّہ مہندی گنج، نزد اندارے والی مسجد لکھنؤ) بابو بھائی کی بیٹی محترمہ ہاجرہ سے ہوئی تھی جن سے ایک بیٹا حمیداللہ اور دو بیٹیاں شمیمہ اور نسیمہ کی ولادت ہوئی۔ دونوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔

سوئے اتفاق سے محترمہ ہاجرہ کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوگیا۔ پھر ۱۹۷۲ء میں نفیس صاحب کی دوسری شادی حاجی محمد علی کی ہمشیرہ خاتون جہاں سے ہوئی جن سے تین بیٹے انیس احمد، رئیس احمد اور محمد ہاشم پیدا ہوئے۔ ماشاء اللہ سبھی بقید حیات اور شادی شدہ ہیں۔

نفیسؔ صاحب نے شاعری کی تمام تر اصناف میں طبع آزمائی کی تھی۔ ایک نظم اور ایک ہی غزل ان کے متذکرہ بھائی حافظ کلیم اللہ صدیقی سے دستیاب ہوسکیں جو حسب ذیل ہیں:-

نظم

پڑھے جو کوئی بشر لا الہ الا اللہ
دکھائے اپنا اثر لا الہ الا اللہ
نہ ہوگا اور کوئی قبر کے اندھیرے میں
بنے گا نور سحر لا الہ الا اللہ
یہی قرار کی صورت ہے بے قراری میں
سکونِ قلب و نظر لا الہ الا اللہ
غمِ یات کا اس کے سوا علاج نہیں
دوائے دردِ جگر لا الہ الا اللہ
نفیسؔ اگر ہے تمہیں فکر منزلِ ہستی
کرو شریکِ سفر لا الہ الا اللہ

غزل

کوئی لمحہ نہیں آتا خوشی کا
نتیجہ ہے کسی کی بے رخی کا
نہ پوچھو ہے جو عالم بے کسی کا
شکستہ ہر نفس ہے زندگی کا
چلو ہم دشمنی سے باز آئے
بڑھاؤ ہاتھ تم بھی دوستی کا
بڑی مطلب پرستی رہ گئی ہے
یہاں جینا ہے مشکل آدمی کا
نظر رعنائیوں میں گم ہوئی ہے
کرشمہ ہے تری جلوہ گری کا
تمہارا بھی نفیسؔ اپنا ہے کوئی
خیال آتا ہے تم کو ہر کسی کا

بہر حال، بہ مشکل تمام، نفیسؔ صاحب کا مجھے اتنا ہی کلام مل سکا۔ ہانڈی کے چند چاولوں کے چھونے اور دبانے

سے پکنے، نہ پکنے یا نصف گلنے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح نفیس صاحب کے مندرجہ کلام سے بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کلام میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ کلام انتہائی پختہ ہے۔ فکر بالیدہ اور سنجیدہ ہے۔ ابھی نفیسؔ صاحب کی عمر ۴۹ برس ہی ہوئی تھی کہ ان کو محسوس ہوا کہ داعیِ اجل سے ملنے کا وقت آ گیا ہے اسی جنونی کیفیت میں نفیسؔ صاحب نے اپنا کلام جو کسی ڈائری میں موجود اور محفوظ تھا، ضائع کر دیا تھا۔ جب ہی تو نشانی کے طور پر چند غزلیں ہی موجود ہیں۔ بہر حال، یہ اردو زبان و ادب کا المیہ ہی کہا جائے گا کہ لوگ قدما اور مشاہیر کا بڑی کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور ان کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جبکہ ضرورت اس بات کی ہے جس نے بھی تھوڑی یا زیادہ اردو شعر و ادب کی خدمت کی ہے یا اردو شعر و ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے، اسے یاد کیا اور رکھا جائے۔ یہ عمل اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ہم قدماء اور مشاہیر کے ہی گن گاتے رہیں۔

نفیسؔ صاحب عمر کے ۴۹ برس ہی مکمل کر پائے تھے کہ ان کو کینسر کا مرض لاحق ہو گیا۔ سات ماہ تک زیر علاج رہے لیکن جانبر نہ ہو سکے۔ اور محض ۵۰ سال کی عمر میں ۲۵ ؍اگست، ۱۹۸۹ء کو (بروز جمعہ) داعیِ اجل سے جا ملے۔ تدفین لکھنؤ کے اسیاء مؤ قبرستان میں عمل میں آئی۔

❑❑❑

سراج منظرؔ
کاکوری، لکھنؤ-Mob.9792055753

غزل

ہوش گنوا کر جھگڑے میں آ جاتے ہیں
بیٹھے بٹھائے خطرے میں آ جاتے ہیں

یاد ہمیشہ ان کی صورت رکھتا ہوں
جو بھی پتھر رستے میں آ جاتے ہیں

جن شعروں میں ذکر تمہارا ہوتا ہے
شعر وہ سارے چرچے میں آ جاتے ہیں

ایسے قابض ہے وہ مجھ پر جیسے لوگ
جناتوں کے قبضے میں آ جاتے ہیں

ان کی فرمائش چھوٹی ہوتی ہے ہم
اچھے خاصے خرچے میں آ جاتے ہیں

ان کے آنے سے روشن ہوتا ہے گھر
چاند ستارے کمرے میں آ جاتے ہیں

خالی رنگ و روپ نہیں آتے منظرؔ
باپ کے گُن بھی بیٹے میں آ جاتے ہیں

●●●

اشتیاق سعید
میرا روڈ، تھانے (مہاراشٹر)-Mob.9930211461

اُووَر بجٹ

کال بیل کی چیخ کمرے کا سکوت منتشر کرتی میرے تخیل پر ضرب آور ہوئی ساتھ ہی صفحۂ قرطاس پر رقصاں قلم تھم گیا اور صفحۂ ذہن پر وسوسوں کا قلم تھرکنے لگا۔ خلافِ توقع اس وقت کون آن دھمکا؟ روم بوائے یا گیسٹ ہاؤس کے دیگر کسی عملہ کا ہونا ممکن نہیں چونکہ اُنھیں کام کے اوقات میں ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت دی جا چکی تھی۔ رہا ڈائرکٹر۔۔ وہ رات دیر سے آنے کا کہہ گیا ہے۔ پھر کون ہو سکتا ہے؟ میری قوتِ متخیلہ بیدار ہو جاتی ہے۔ کہیں پروڈیوسر تو نہیں؟ ارے ہاں! آج وہ آنے والا بھی ہے۔ ڈائرکٹر نے تو ایسا ہی کہا تھا۔۔۔

ڈائرکٹر کا نام امر بھان ہے۔ سُپر فلمز کے پرچم تلے سلام الدین اور چندر موہن کی اوّلین فلم کی اسکرپٹ زیرِ تحریر ہے۔ اس ضمن میں پروڈیوسر نے اوسط درجے کے گیسٹ ہاوس میں کمرہ بُک کر رکھا ہے۔ جہاں میں پچھلے دو مہینوں سے بلا معاوضہ کاغذ قلم سے سر کھپا رہا ہوں۔ معاوضہ کے تقاضے پر ڈائرکٹر خوش اُسلوبی سے بہلا دیتا ہے۔۔

اب کال بیل کے ساتھ ساتھ کواڑ پر تھاپ سنائی پڑتی ہے۔ میں ہڑ بڑا کے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور لپک کر لیچ ٹرن کرتا ہوں۔ دروازہ کھلتے ہی ڈائرکٹر اور پروڈیوسر پر نگاہ ٹھہرتی ہے دونوں شاپنگ بیگ سے لدے پھندے مجھے گھور رہے ہوتے ہیں۔ ان کے عقب سے ایک نوخیز دوشیزہ برآمد ہوتی ہے جو برائے نام لباس زیب تن کیے ہوتی ہے میں ان سبوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے آداب بجا لاتا ہوں۔ پروڈیوسر خشمگیں نگاہوں سے تکتے ہوئے مجھ سے استفسار کرتا ہے۔

''سو رہے تھے کیا؟''۔

'' نہیں تو۔۔''

'' پھر دروازہ کھولنے میں اتنی دیر۔۔۔؟''

کہتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی اندر داخل ہوتے ہیں۔۔۔ ڈائرکٹر بیڈ پر بیٹھ کر شاپنگ بیگ سے ملبوسات نکال کر پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ پروڈیوسر ایزی چیئر پر پسر جاتا ہے۔ دوشیزہ ڈائرکٹر کے پہلو نشین ہو جاتی ہے۔ ڈائرکٹر بیگ سے جوتوں کا بکس نکالتے ہوئے گویا ہوتا ہے۔

''شو بڑا بنداس ملا ہے سلام بھائی۔ ایسے ہی شوز ڈائرکٹر کی ڈیگینٹی (Diginity) ظاہر کرتے ہیں''۔

''امر بھائی ہے بھی تو دو ہزار کا''۔ پروڈیوسر جھک کر سیدھا ہو جاتا ہے۔'' کچھ بھی بولو اب تک کی زندگی میں تم نے اتنے

قیمتی جوتوں کے بارے میں سوچا تک نہ ہوگا۔ پھر یار تم ہماری فلم کے ڈائرکٹر ہو۔۔۔۔ ہم ڈائرکٹر بنائیں گے تبھی تو ہمیں تم بناؤگے۔۔۔۔ کیوں شرمیلی جی؟''۔

شرمیلی بجائے کچھ کہنے کے دانتوں کی نمائش کرتی ہے۔۔۔۔

'' شرمیلی۔۔۔۔ یہ کاسٹیوم پہنو تو۔۔۔۔ دیکھیں کیسی لگتی ہو۔ ڈائرکٹر کی فرمائش پر وہ کاسٹیوم لے کر دیکھتی ہے۔''سر یہ تو سوئمنگ کاسٹیوم ہے''۔۔

''آئی نو۔۔۔۔ بٹ میں تمہارا فیگر دیکھنا چاہتا ہوں''۔

''وہ تو آپ اس کے بغیر بھی۔۔۔۔!''۔

کہتے ہوئے اُچک کر بیڈ پر کھڑی ہوجاتی ہے اور آن کی آن میں جسم سے لباس یوں اتار پھینکتی ہے جیسے ہم آپ کیلا چھل کر چھلکا پھینک دیتے ہیں۔ ڈائرکٹر اُٹھ کر اس کے جسم کے نشیب وفراز کا جائزہ لیتا ہے اور اسے دوبارہ بالباس ہونے کا حکم صادر کرتے ہوئے پروڈیوسر سے مخاطب ہوتا ہے۔

'' سلام بھائی فیگر وائز شرمیلی ہیروئن کے لیے بالکل فٹ ہے، سائن کرلو۔ ادروائز (other wi se) کسی اور پروڈکشن نے پہل کردی تو۔۔۔''

''ارے بھائی میں نے کب انکار کیا۔۔۔۔ پھر ہماری پروڈکشن کے کرتا دھرتا تو تم ہی ہو''۔

تھینک یو۔۔۔ تھینک یو' ڈائرکٹر کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ پھر آن کی آن میں سائننگ لیٹر کی خانہ پُری ہوتی ہے اور پانچ ہزار نقد لفافہ میں رکھ کر بصد خلوص اسے پیش کیا جاتا ہے۔۔۔

وہ غازہ ملے چہرہ پر خوشیوں کی سُرخی بکھیرتی لفافہ قبول کر کے پروڈیوسر سے ہاتھ ملاکر شکریہ ادا کرتی ہے اور ڈائرکٹر کے چرن چھوتی ہے۔ میری جانب مڑتی ہے تو جانے کیوں میں اسے متاسف نگاہوں سے تکتے ہوئے سوچتا ہوں۔ کاش میں بھی ہیروئین ہوتا۔۔۔۔!

ڈائرکٹر زیرِ لب مُسکراتے ہوئے پروڈیوسر سے کہتا ہے۔ ''ارے بھائی آپ کی ہیروین سائن ہوگئی، موقع خوشی کا ہے۔ اب تو شراب اور کباب کا ایک دور چلنا ہی چاہئے کیوں شرمیلی جی؟''۔۔۔۔

''ایز یو وش'' (As you wish)

شرمیلی شانے اچکاتی ہے۔۔

''منگوالو بھائی''۔۔۔

پروڈیوسر پژمردہ لہجہ میں گویا ہوتا ہے۔ ڈائرکٹر فوراً انٹرکوم پر آرڈر نوٹ کراتا ہے۔۔۔ اس سے قبل کہ شراب کا دور شروع ہو میں ڈائرکٹر سے مخاطب ہوتا ہوں۔

''امر بھائی''

''کیا ہے؟''

وہ ناگواری ظاہر کرتا ہے۔۔

''ایک منٹ ذرا۔۔۔۔''

جملہ پورا ہو بھی نہیں پاتا کہ وہ کرخت لہجہ اپنا لیتا ہے۔

''دیکھو اس وقت میں بہت ہی اچھے موڈ میں ہوں ''۔۔۔۔

''لیکن امر بھائی۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔!''

وہ سنی ان سنی کرکے پروڈیوسر سے مخاطب ہو جاتا ہے۔

''ہاں تو مسٹر پروڈیوسر اب آپ کا اگلا پروگرام کیا ہے؟''۔

''شراب سے حلق تر کریں گے اور تین چار ہزار روپیوں کا سوگ مناتے گھر لوٹ جائیں گے''۔۔۔۔

''واہ۔۔۔کیا ڈائیلاگ ہے''۔۔۔۔

ڈائرکٹر قہقہہ لگاتا ہے۔۔۔

''یار تمہیں پروڈیوسر نہیں ڈائیلاگس رائٹر ہونا چاہئے تھا۔''

'' لاحول بھیجو یار۔۔۔۔ ڈائیلاگ رائٹر بن کر بھوکوں مرنا ہے کیا۔۔؟''

کہتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے میری جانب دیکھتا ہے۔ میرے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔۔۔۔

ڈائریکٹر جھنجھلا جاتا ہے۔

''پانے کے لئے کھونا پڑتا ہے سلام بھائی، قربانی دینا ہوتی ہے۔۔۔خواہشوں، تمناؤں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔۔۔۔بھوک پیاس کا مرڈر کرنا ہوتا ہے''۔ ایک ہی سانس میں کہتا جاتا ہے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوتی ہے پروڈیوسر ہانک لگاتا ہے۔

''آجاؤ بھائی۔۔۔دروازہ کھلا ہے''۔

روم بوائے بڑے سے قاب میں پینے پلانے کے تمام لوازمات لئے وارد ہوتا ہے اور بڑے ہی اہتمام سے ٹیبل پر ایک ایک چیز چن دیتا ہے۔ پھر بوتل کی کاگ کھولتے ہوئے استفسار کرتا ہے۔

''ساب اور کچھ؟''

ڈائرکٹر پروڈیوسر کی جانب سوالیہ نگاہوں سے تکتا ہے۔ پروڈیوسر نفی میں سر کو جنبش دیتا ہے۔ روم بوائے کمرے سے جانے کو ہوتا ہے کہ شرمیلی آواز دیتی ہے۔

''ٹھہرو!''۔

پھر مجھ سے مخاطب ہوتی ہے۔۔

''رائٹر صاحب!''

''جی!''

میں لکھتے لکھتے نگاہ اُٹھاتا ہوں۔۔۔۔

''کچھ لیں گے آپ؟''

''جی۔۔۔۔میں شراب نہیں پیتا''۔۔۔۔

''آئی نو۔۔۔۔بٹ سافٹ ڈرنگ تو لے ہی سکتے ہو؟''

''کیا! سافٹ ڈرنک؟''

ڈائرکٹر بے ساختہ بول پڑتا ہے۔۔۔

''اوہ شرمیلی تم بھی کمال کرتی ہو۔ رائٹرس کی خوراک چائے ہوتی ہے چائے۔۔۔۔''

''ساب چالو چائے یا پیشل؟''

روم بوائے اِستفسار کرتا ہے۔

''اے پیشل لا۔۔۔۔''

پروڈیوسر جھنجھلا جاتا ہے۔

''چالو چائے بھی کوئی چائے ہوتی ہے''۔۔۔

روم بوائے پورا جملہ سُنے بغیر کمرے سے نکل جاتا ہے۔شرمیلی بیڈ پر بیٹھے ہی بیٹھے ساقی بن جاتی ہے اور ڈائرکٹر پروڈیوسر کو گھورنے لگتا ہے۔لیکن پروڈیوسر پر اس عمل کا کوئی ردعمل نہ پاکر اندر ہی اندر پیچ وتاب کھانے لگتا ہے پھر نگاہیں اُٹھائے بغیر کہتا ہے۔

''سلام بھائی ۔۔۔ ایک بات اچھی طرح ذہن میں نوٹ کرلو کہ کسے چالو کسے سپشل چائے دینا ہے یہ میرا لُک آؤٹ ہے ۔۔۔اگر ایسے ہی تمہیں حاتم طائی کی اولاد بننے کا شوق چراتا رہا تو بجٹ آگے بھاگے گا اور فلم اوور بجٹ ہو جائے گی''۔

''کیا !''

شرمیلی چونک پڑتی ہے اوراس کے ہاتھ سے شراب کی بھری بوتل فرش پر گر کر چھنا کا پیدا کرتی ہے۔اس چھنا کے میں شرمیلی کے لبوں سے

''سوری''

اور بہ یک وقت ڈائرکٹر اور پروڈیوسر کے ہونٹوں سے

''کوئی بات نہیں''

پھسلتا ہے۔شرمیلی سہمے ہوئے لہجہ میں غالبًا سرگوشی کرتی ہے۔

''لیکن سر۔۔فلم کا بجٹ ؟؟''

❑❑❑

تخلیق کاروں سے گذارش

اپنی تخلیقات رنگارشات صفحہ کے ایک طرف ہی لکھیں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔

ای۔میل سے بھیجی ہوئی تخلیقات رنگارشات کی ہارڈ کاپی جس پر آپ کا پتہ اور موبائل نمبر صاف صاف درج ہو، بھیجنے کی زحمت کریں۔

جو تخلیقات کسی وجہ سے شائع نہیں ہوں گی، ان کی واپسی کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہوگی۔

تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام ، شاخ کا نام،آئی۔ ایف۔ ایس۔سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اتر پردیش اردو اکادمی بچوں کے مزاج ومعیار کے لحاظ سے

ماہنامہ باغیچہ

پورے آب وتاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔

۱۔آپ اپنی تخلیقات بھیج کر

۲۔خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر

۳۔بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق بیدار کر کے اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

مظہرؔ زاہدی
گلزار باغ، پٹنہ -Mob.9934410620

غزل

رشتہ ہمارے دل کا ہے اس آشنا کے ساتھ
زخموں کے پھول دیتا ہے ہم کو ادا کے ساتھ

سانسیں نہ ٹوٹ جائیں کہیں انتظار میں
جانے کب آئے گا وہ مسیحا دوا کے ساتھ

دامن بچا کے مجھ سے گذرتے ہیں حادثے
گھر سے جو میں نکلتا ہوں ماں کی دعا کے ساتھ

ممکن نہیں کہ کوئی بھی سازش ہو کامیاب
جب تک کہ مل نہ جائے عدو، آشنا کے ساتھ

جو پی چکے ہمارے لہو کو نچوڑ کر
ملتے ہیں پھر بھی ہم سے وہ جوشِ ادا کے ساتھ

مظہرؔ یہ ہے خلوص تجسس کی صرف بات
ان سے جو کی وفا، یہ ہے گویا خدا کے ساتھ

●●●

جمال الدین نوازؔ
شعبۂ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، تلنگانہ -Mob.7007840084

غزل

کون جانے کس گھڑی کیا سانحہ ہو جائے گا
ہے ابھی جو دسترس میں نارسا ہو جائے گا

میرے زندانِ تصور میں جو اب بھی قید ہے
اک نہ اک دن وہ پرندہ بھی رہا جائے گا

شمع امید سحر پہلے پہر بجھ جائے گی
آخر شب تک ہر اک تارا جدا ہو جائے گا

دھیرے دھیرے مٹ ہی جائے گا ہر اک شے کا وجود
رفتہ رفتہ دل مکمل نقش لا جائے گا

کہہ گئے سیراب ہو کر تشنگی سے تشنہ لب
تیری ان بنجر صداؤں سے بھی کیا جائے گا

اس کی آنکھوں کا سمندر اور ہم طوفاں بدوش
دیکھنا ہے کیا بچے گا کیا فنا جائے گا

●●●

تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا لازمی ہے۔

تبصرہ

نام کتاب : بزم غزل

شاعر : نجمی لکھنوی

قیمت : ۲۰۰/- روپے

ملنے کا پتہ : دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

سنہ اشاعت : ۲۰۲۳ء

مبصر : ڈاکٹر اسلم مرتضٰی

موبائل نمبر : 9559043204

''بزمِ غزل''، نور محمد نجمی لکھنوی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے اس سے قبل ''رنگِ غزل'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے رونق لکھنوی کی شاعرانہ عظمت کو بروئے کار لاتے ہوئے حیات اور شاعری پر کتاب شائع کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب خالص صنف غزل پر مشتمل ہے۔ آخری صفحہ پر صرف ایک قطعہ شاملِ کتاب ہے۔ تعارف میں عبرت لکھنوی اور بیدل مراد آبادی سے شرف تلمذ کے ذکر کے بعد احمد ابراہیم علوی، پروفیسر احسن رضوی اور ڈاکٹر معراج کے تجزیے اور تاثرات شامل ہیں۔

نجمی صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش کا کہیں پر ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ ۱۹۶۳ء سے آج تک گیسوئے غزل کے اسیر ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے ایک بزرگ شاعر جناب لکشمی نرائن افق لکھنوی حیات اور شاعری مرتب کی جو اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے منظر عام پر آئی۔''

(بزمِ غزل ص ۲۴) مذکورہ عبارت کی روشنی میں نجمی صاحب کی عمر سوا سو سال سے زیادہ ہوگی۔

نجمی صاحب بھی غزل کے جادو سے پوری طرح واقف ہیں اسی لئے انھوں نے غزل کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ''غزل'' کے عنوان سے جو غزل کہی ہے، اس غزل کے چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں جس سے شاعر کے فکر وفن کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

جو لوگ ادب سے نہیں رکھتے ہیں تعلق
وہ لوگ کہاں سمجھیں گے معیار غزل کے

تاریخ کے اوراق اٹھا کر کوئی دیکھے
ہر دَور میں ملتے ہیں طلبگار غزل کے

غالبؔ ہوں کہ مومنؔ ہوں یا ہوں میر تقی میرؔ
تاریخ کا عنوان ہیں فنکار غزل کے

نور محمد نجمی لکھنوی نے اپنی غزلوں میں دل پر گذرنے والی کیفیات بہت آسان اور سیدھے سادے الفاظ میں اس طرح بیان کی ہیں کہ اس میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی ہے خواہ وہ روایتی غزلوں کے اشعار ہوں یا پھر

عصری مسائل کی عکاسی ہو۔ یہی سبب ہے کہ ادب کا ادنیٰ سا ادنیٰ قاری اور سامع ان کی غزلوں کے اشعار سے محظوظ ہوتا ہے۔ ممتاز صحافی اور ادیب جناب احمد ابراہیم علوی ان کی شاعرانہ خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں کامیاب شاعر قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''نجمی اردو غزل کی روایات ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہیں تو عصری ضرورتوں کو بھلا نہیں دیتے، اسی لئے ان اشعار میں زندگی غالب رہتی ہے کبھی کبھی کیف و سرور کی بھی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو مسائل حیات و کائنات سے وابستگی کو سلیقے سے برقرار رکھا جاتا ہے۔ نغمہ، کیف، سرور، درد، اثر جب سبھی کچھ اشعار میں نمایاں ہو تو انہیں کامیاب نہ کہنا جرم اور کفر ہی قرار دیا جائے گا۔ نجمی کے اشعار میں درد ہے تو اثر بھی، حسنِ خیال ہے تو طرزِ جدید بھی اس لئے ان کے پڑھنے کے لئے خاص کیفیت کی ضرورت نہیں بلکہ پڑھنے سے خاص کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ انہیں ایک اچھا اور کامیاب شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔'' ص ۱۳

نجمی صاحب دبستان لکھنؤ کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جو کئی دہائیوں سے صنفِ غزل میں طبع آزمائی کر رہے ہیں زمانے کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف ہیں زندگی کے تمام مسائل اور حالات پر گہری نظر ہے ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تمام واقعات و معاملات کو بہت باریک نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے جس کا اندازہ ذیل کے ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بڑی چابک دستی سے آسان اور عام فہم الفاظ میں واقعات بیان کئے ہیں۔

اے گردشِ زمانہ یہ احسان ہے ترا
موسم کی طرح دوست بھی کیسے بدل گئے

احساس ظالموں کو کبھی ہوگا دوستوں!
یہ شور ظلم و جور کا نجمی کدھر نہیں

یہ حوصلے ہیں ہمارے وطن پہ مٹنے کے
کہ سوئے دار بھی نجمی جو مسکرا کر چلے

کس خواب زندگی میں فراموش ہو گیا
منظر بدل چکا ہے ذرا سر اٹھا کے دیکھ

نجمی صاحب کا شعری سفر جاری ہے دبستان لکھنؤ کی قدیم انجمنوں سے ان کی وابستگی رہی ہے اور آج بھی لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں ان کی شرکت رہتی ہے شاعروں اور ادیبوں کا وسیع حلقہ ہے مستقبل میں شعر و ادب کو ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ان کے صفات و کمال کا ذکر آفتاب اثر ٹانڈوی ایک قطعہ میں اس طرح کرتے ہیں۔

دوستوں کے ہمدم و غم خوار نجمی لکھنوی
اور شریف النفس باکردار نجمی لکھنوی

کیا تعجب جو ملی ان کو سند توصیف کی
ہیں اسی اعزاز کے حق دار نجمی لکھنوی

مختصر یہ کہ ''بزم غزل'' میں کمپوزنگ کی غلطیاں موجود ہیں جنہیں قلم کی مدد سے درست کرنے کے باوجود بھی ختم نہیں کیا جا سکا۔ کاغذ عمدہ ہے اور کور بھی دیدہ زیب ہے پشت پر شاعر کی تصویر شناخت کے طور پر شامل ہے۔ امکان ہے کہ نور محمد نجمی کا دوسرا شعری مجموعہ ''بزم غزل'' عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

❑❑❑

R. No. 25039/72
U.P. Urdu Akademi

Khabarnama

उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा

اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ

Vol. No. 52 November 2023 Issue No. 5

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں / دار المطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہنامہ ''خبرنامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اقلیتی طلباء کو ''سول سروسیز کی تیاری کے لئے اردو آئی-اے-ایس-اسٹڈی سینٹر'' اور ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر۔

یونیورسٹی سطح کی نصابی کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
-1	ادب پارے (نثر)	سید احتشام حسین	45/=	-10	انتخاب منظومات (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	55/=
-2	ادب پارے (نظم)	سید احتشام حسین	45/=	-11	'' نثر (حصہ اول)	مجلس مشاورت	62/=
-3	انارکلی	امتیاز علی تاج	43/=	-12	'' نثر (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	78/=
-4	انتخاب افسانہ	مجلس مشاورت	134/=	-13	بکٹ کہانی	نور الحسن ہاشمی	45/=
-5	'' خطوط غالب	مجلس مشاورت	28/=	-14	لازمی نصاب	حکم چند نیر	46/=
-6	'' غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	70/=	-15	معیاری نثر و نظم	حامد ندیم	73/=
-7	'' قصائد	مجلس مشاورت	64/=	-16	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	135/=
-8	'' مراثی	مجلس مشاورت	120/=	-17	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
-9	'' منظومات (حصہ اول)	مجلس مشاورت	54/=				

شخصیات سیریز

نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت
-1	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	438/=	-10	سالک لکھنوی	پروفیسر مظفر حنفی	216/=
-2	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=	-11	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر ذکی طارق	216/=
-3	کلیم عاجز	,, مناظر عاشق ہرگانوی	288/=	-12	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/=
-4	زبیر رضوی	ڈاکٹر مہتاب امروہوی	262/=	-13	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=
-5	نشتر خانقاہی	اسد رضا	260/=	-14	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=
-6	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=	-15	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=
-7	مظہر امام	امام اعظم	208/=	-16	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=
-8	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	233/=	-17	معراج فیض آبادی	ڈاکٹر کلیم قیصر	245/=
-9	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=				

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010

سیلس ڈپو-موبائل نمبر 7081007078

Website:www.upurduakdemi.org E-mail:upurduakademi3@gmail.com